نادیدہ

زود حرف کلام

اقبال عظیم

نادیدہ

روحِ کلام

اقبال عظیم

مرتب کتاب - سیّد سیّد اعظیمؔ

ناشر - سیّد اقبال عظیمؔ

پریس فیرنین پبلشرز کراچی
فون:- ۲۱۷۹۱۹-۲۱۳۹۳۲

تاریخ اشاعت دوم - جولائی ۱۹۸۹ء

تعداد کتب - ایک ہزار [۱۰۰۰]

قیمت - ۵۰/- پچاس روپے

کتابت - محمد اسحاق گجراتی

ترتیب

انتساب

لکھنؤ یونیورسٹی کے نام جہاں سے اقبالؔ بھائی نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور جو ہم بھائیوں کی مشترک مادرِ علمی ہے۔

گزارشاتِ مرتّب

اساتذہ سے یہی سُنا، کتابوں میں بھی یہی پڑھا، اہلِ نظر کو بھی اسی اصول پر متفق پایا اور ذاتی تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اگر کسی شاعر کے مقام کا تعین مقصود ہو تو اس کے منتخب کلام کو بنیاد بنانا چاہئے، کلیات کو نہیں۔ اس اصول سے دو باتیں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس کا پورا کلام انتخاب نہیں ہوتا۔ اور دوم یہ کہ انتخاب بہرحال ایک اہم ادبی ضرورت ہے جس کے بغیر شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ذہنی انتشار اور غیر معمولی مصروفیات کے اس دور میں کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ آئے دن شائع ہونے والے بے شمار شعری مجموعوں میں سے ہر ایک کا بالاستیعاب مطالعہ کرسکے۔ اس بات کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دانشورانِ ادب بھی کسی کتاب پر اظہارِ رائے کے لئے کتاب کا صرف سرسری مطالعہ کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں اس لئے کہ اظہارِ رائے کی فرمائشوں کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ نتیجہ اس صورتِ حال کا یہ ہوتا ہے کہ بعض بہت اچھے اشعار بھرپور توجہ سے، مستحق شاعر صحیح قدرشناسی سے اور ہمارا شعری سرمایہ اکثر نوادرِ سخن سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس نے مجھے اقبال بھائی کے منتخب اشعار کی اشاعت پر آمادہ کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء تک صرف چھ سال کی مدت میں اقبال بھائی کے تین شعری مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور تینوں مجموعوں کی غیر معمولی پذیرائی

ہوئی یہاں تک کہ بعض قدر دانوں نے بڑے بڑے نذرانے پیش کرکے کتابوں کی دستخط شدہ جلدیں حاصل کیں اور ہر کتاب شائع ہوتے ہی عنقا ہوگئی اور دوبارہ چھپی۔ یہ بھی تسلیم کہ اقبال بھائی کی آواز میں ان کی غزلوں کے ٹیپ نہ صرف وطن میں گھر گھر پھیلے ہوئے ہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی تحفتہً بھیجے جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ پچھلے ۳۰، ۴۰ برسوں میں مشاعروں کے توسط سے اقبال بھائی کو جس غیر معمولی داد و تحسین سے نوازا گیا ہے وہ کم شعراء کو میسّر آتی ہے لیکن دراصل جہاں تک تعینِ مقام کا سوال ہے ان باتوں میں سے کسی کو مستند نہیں مانا جا سکتا۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ ان کے منتخب اشعار زیادہ سے زیادہ اہلِ نظر تک پہنچائے جائیں تاکہ ان کی صحیح قدر قیمت پہچانی جا سکے۔ اشاعت کا ارادہ تو کر لیا گیا لیکن سوال پیدا ہوا کہ یہ انتخاب کرے کون؟ تین خوش مذاق حضرات نے مختلف وقتوں میں رضا کارانہ طور پر یہ زحمت قبول بھی فرمائی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہر انتخاب باقی دو انتخابات سے کافی مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر انتخابات کرنے والوں کا دائرہ وسیع تر کیا جاتا تو یہ اختلاف اور بڑھتا اس لئے میں نے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کر ڈالا اور وہ یہ کہ انتخاب کی درخواست خود اقبال بھائی سے کر دی جو انتخاب کے معاملے میں بڑے سخت گیر ہیں اور خود اپنے اشعار کے معاملے میں بھی کسی قسم کی رعایت کے سرے سے قائل نہیں۔ میں خوش تھا کہ میں نے ایک نہایت مشکل سوال کا حل دریافت کر لیا لیکن اقبال بھائی نے یہ فرمایا کہ تم خود انتخاب کر لو۔ بعد میں میں بھی دیکھ لوں گا۔ یہ کام میرے لئے آسان بھی تھا اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ میں نے اِن کا سارا کلام پڑھا بھی ہے اور سُنا بھی ہے اور بہت کچھ ذہن میں محفوظ بھی

ہے اور مشکل اس لئے کہ انتخاب کرتے وقت تعدادِ اشعار کی حد قائم کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ بہرحال سخت کاوش کے بعد کوئی تین سو اشعار منتخب کرکے اقبال بھائی کے سامنے رکھ دیے اور انھوں نے ان میں سے تقریباً پچاس فی صد اشعار بڑی بے تکلفی سے قلم زد کرکے کچھ اشعار کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا۔ میں نے انتخاب پر بہت محنت کی تھی اور کافی وقت صرف کیا تھا اس لئے یہ دریافت کرنا بھی میں نے ضروری سمجھا کہ اتنی بڑی تعداد میں اشعار حذف کرتے وقت ان کے ذہن میں کون سا معیار تھا اور انھوں نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا وہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی اس لئے لفظ بہ لفظ بیان کرتا ہوں:

"میرے نزدیک معیار ایک مبہم ادبی اصطلاح ہے جس کی حدود کا تعین آسان نہیں۔ اس لئے نہ تم معیار کا نام لو اور نہ یہ بات مجھ سے کہلواؤ۔ اس کا فیصلہ غیر جانبدار اہلِ رائے پر چھوڑ دو۔ ہاں تمھارے سوال کے جواب میں جو بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب جو اشعار تمھارے سامنے ہیں میں انھیں منتخب سامعین کی کسی محفل میں بھی پورے اعتماد سے پڑھ سکتا ہوں اور بس! اور اگر یہ اشعار میرے منتخب کلام کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوں تو نہ مجھے اس بات پر کوئی ندامت ہوگی اور نہ اس معاملے میں میں کسرِ نفسی کا اظہار کروں گا۔"

چنانچہ اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کیے بغیر یہ انتخاب اس یقین کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ اقبال بھائی کے سامعین اور قارئین اس

انتخاب میں اپنی طرف سے بھی مزید اضافہ کرنا چاہیں گے۔

زندگی کے سینتیس[۳۷] سال ہندوستان میں اور بیس[۲۰] سال مشرقی پاکستان میں گزارنے کے بعد اقبال بھائی اپنی بجھی ہوئی آنکھیں اور پینشن کا پروانہ لیے ۱۵ر جولائی ۱۹۷۰ء کو کراچی پہنچے اور نووارد ہونے کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے تیز رفتاری کے ساتھ پہلے کراچی میں، پھر سارے ملک میں اور بعد ازاں بیرونِ ملک انھیں جو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن اس بات کا علم کم لوگوں کو تھا بلکہ آج بھی عام طور پر معلوم نہیں کہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے خوش اسلوب نثر نگار کی حیثیت سے، ایک محقق کی حیثیت سے، ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے، اردو کے ایک جفاکش رضا کار اور خادم کی حیثیت سے اور ایک خوش بیان مقرر کی حیثیت سے بھی وہ ایک شاندار ماضی گذار آئے ہیں۔ یہ بے خبری یقیناً بے انصافی کی بات ہے اس لئے میں نے اپنا فرض جانا کہ جہاں تک اس کتابچے کا محدود حجم اجازت دے ان حیثیتوں پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈالتا چلوں۔ لہٰذا رسمی تعارف کے ساتھ ساتھ میں نے ان کی نجی زندگی کا ایک مختصر سا غیر رسمی جائزہ بھی پیش کیا ہے، تحقیقی کام کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور بابائے اُردو کا تحریر کردہ وہ تبصرہ بھی شاملِ کتاب کر دیا ہے جو انھوں نے اقبال بھائی کی خاص نثری تصنیف "مشرقی بنگال میں اُردو" پر تحریر کیا اور سہ ماہی "اُردو" میں شائع ہوا۔ ویسے تو اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف کرنے والوں میں ماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور، احتشام حسین رضوی، مسعود حسن ادیب، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی،

رضا علی وحشت اور درجنوں دیگر دانشور شامل ہیں۔ لیکن موضوعِ کتاب کے اعتبار سے بابائے اُردو کے تبصرے کو مستند ترین جان کر اسی پر اکتفا کیا۔ جہاں تک خدماتِ زبان کا تعلق ہے ان کی کہانی طویل ہے جس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں۔ اس لئے اختصار کے خیال سے خود اقبال بھائی کی تحریر کا صرف ایک اقتباس، نقل کر دیا گیا ہے جس سے بڑی حد تک بات سمجھ میں آجائے گی۔ یہ سب کچھ مختصر سہی لیکن نہ ہونے سے بہتر ہے۔ بہرحال یاددہانی ضروری ہے کہ اس کتاب کا اصل مقصد اقبال بھائی کا منتخب کلام پیش کرنا ہے، باقی باتیں ضمنی ہیں۔

مزید :

اس انتخاب میں چالیس فیصد سے زیادہ اشعار تازہ غزلوں سے ماخوذ ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں۔

تعارفِ شاعر

پیدائش : ۸؍جولائی ۱۹۱۳ء، میرٹھ، یو۔پی، ہندوستان

وطنیت : آبائی وطن قصبہ انبہٹہ، ضلع سہارن پور لیکن تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی، اس لئے لکھنؤ ہی سے وطن جیسی وابستگی ہے۔

روایات : ۱۔ دادا صاحب قبلہ سیّد فضل عظیم فضلؔ، اُردو اور فارسی کے نعت گو شاعر

۲۔ نانا صاحب قبلہ حضرت ادیبؔ میرٹھی تلمیذ بیانؔ و یزدانی میرٹھی۔ صاحبِ دیوان غزل گو شاعر

۳۔ والدِ محترم سیّد مقبول عظیم عرشؔ، اُردو کے غزل گو شاعر

۴۔ برادر بزرگ سیّد وقار عظیم مرحوم، برِ صغیر کے بلند مرتبہ تنقید نگار اور ماہرِ تعلیم، درجنوں تصانیف یادگار

تعلیم : ۱۔ بی۔اے، لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۳۴ء

۲۔ ایم۔اے، اُردو، فرسٹ کلاس فرسٹ، آگرہ یونیورسٹی ۱۹۴۳ء

۳۔ ریسیرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی ۵۲-۱۹۵۱ء۔ نامکمل تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

۴۔ سندِ معلمی، ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ ۱۹۳۵ء
۵۔ ہندی اور بنگلا کے اعلیٰ معیار امتحانات ۱۹۴۱ء، ۱۹۶۵ء لکھنؤ، ڈھاکہ

ملازمت : ۱۔ معلم انگریزی و اُردو، گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ اور دیگر گورنمنٹ تعلیمی ادارے ۱۹۳۹ء تا جولائی ۱۹۵۰ء
۲۔ لیکچرار اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکہ اگست ۱۹۵۰ء تا ستمبر ۱۹۵۱ء
۳۔ پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو (سینیر ایجوکیشن سروس، حکومت مشرقی پاکستان) ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۰ء
۴۔ سینیر ریسیرچ آفیسر، سکریٹریٹ حکومت مشرقی پاکستان (عاریتاً) ۱۹۶۵ء ۔ ۱۹۷۰ء
(On Deputation.)

تصانیف : ۱۔ مشرقی بنگال میں اُردو، دو سو سالہ لسانی و ادبی تذکرہ ۱۹۵۴ء
۲۔ مضراب، پہلا مجموعۂ غزلیات ۱۹۷۵ء
۳۔ قابِ قوسین۔ مجموعۂ نعتیہ کلام ۱۹۷۷ء
۴۔ مضراب و رباب۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۸۱ء
۵۔ دیوانِ ناطق۔ حکیم ناطق لکھنوی کے دیوان کی ترتیب، تدوین اور اشاعت مع مقدمہ، ۱۹۵۶ء
۶۔ سات ستارے : سات معمارانِ پاکستان کے سوانح

۷۔ مشرق : مشرقی پاکستان سے متعلق ادبی، لسانی، معاشرتی اور ثقافتی مضامین

۸۔ انگریزی زبان میں انیس ۱۹ اضلاع مشرقی پاکستان سے متعلق ادبی اور لسانی، تحقیقی مقالات، ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۷۰ء

۹۔ درجنوں نصابی کتابیں جو درجۂ سوم تا بی۔ اے شاملِ نصاب رہیں

زیرِ ترتیب کتابیں :

۱۔ آنکھوں دیکھی۔ شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا۔

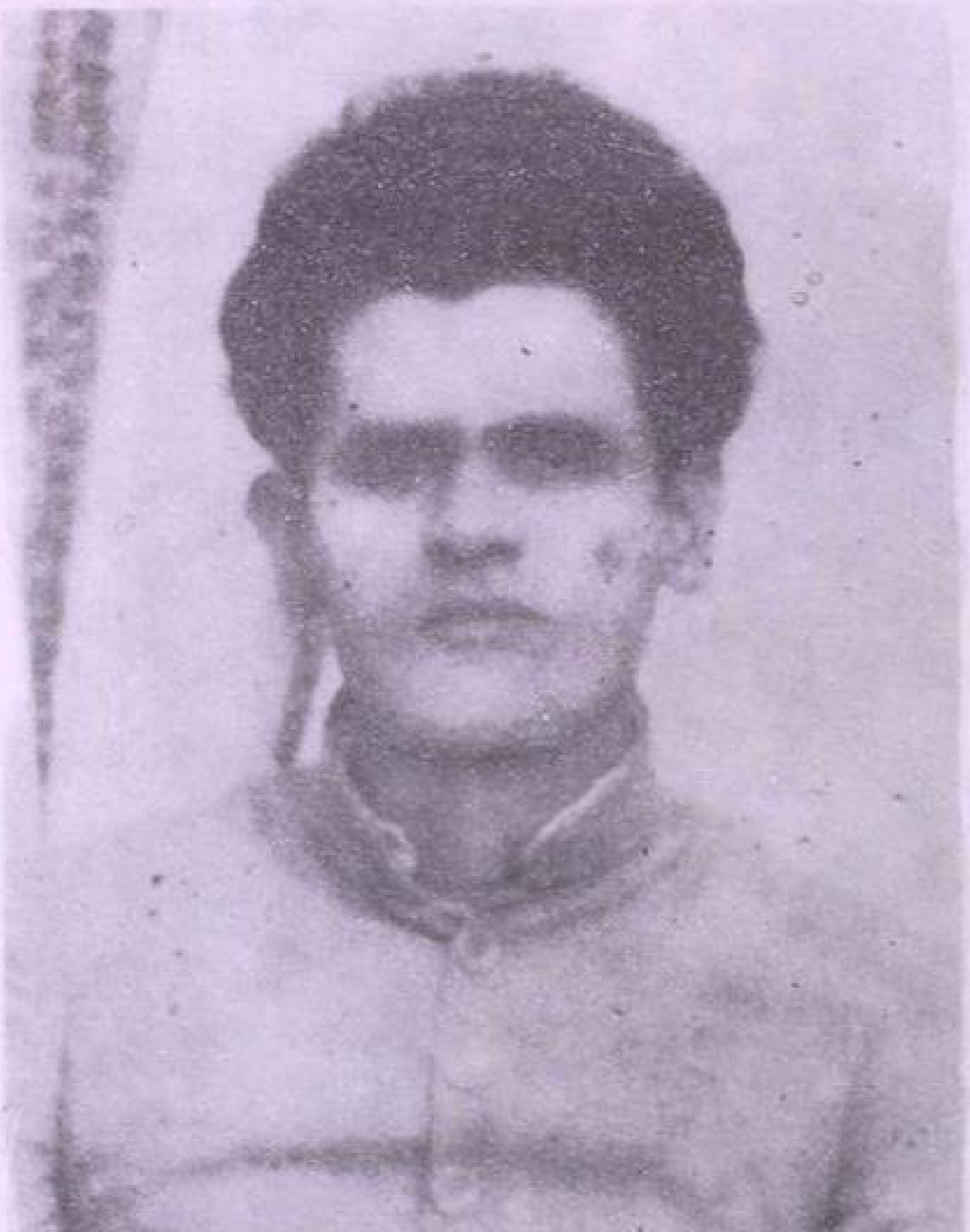
۲۔ روحِ سخن۔ جدید و قدیم شعراء کے غیر معروف اور منتخب اشعار۔

۳۔ رہنمائے تلفظ

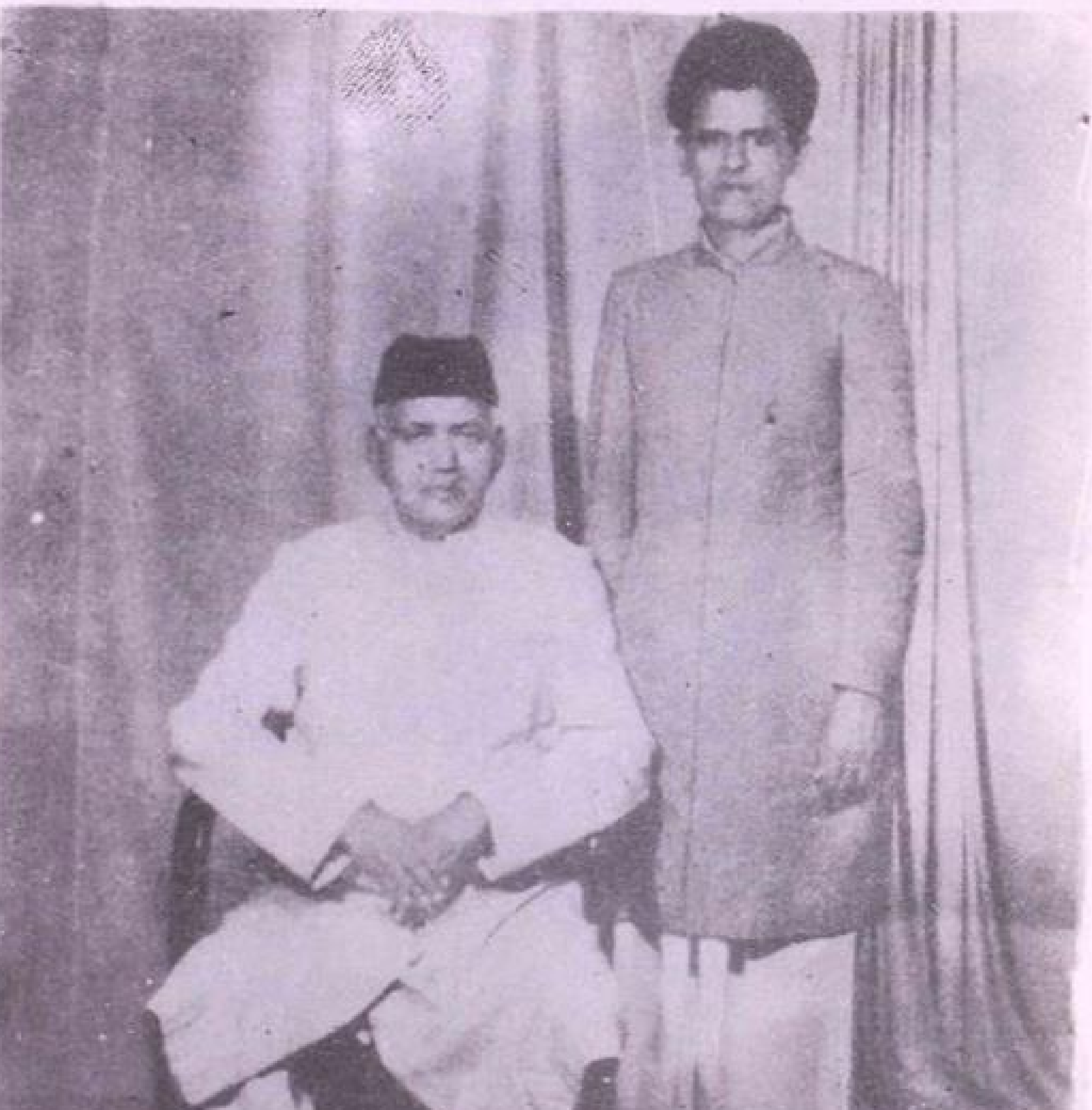
۴۔ ماحصل۔ کلیات

موجودہ پتہ :

۸۔بی۔کیپری اپارٹمنٹ کے۔ڈی۔اے
اسکیم نمبر ا۔ کراچی۔۸



لکھنؤ ۱۹۴۰ء



ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۰ء

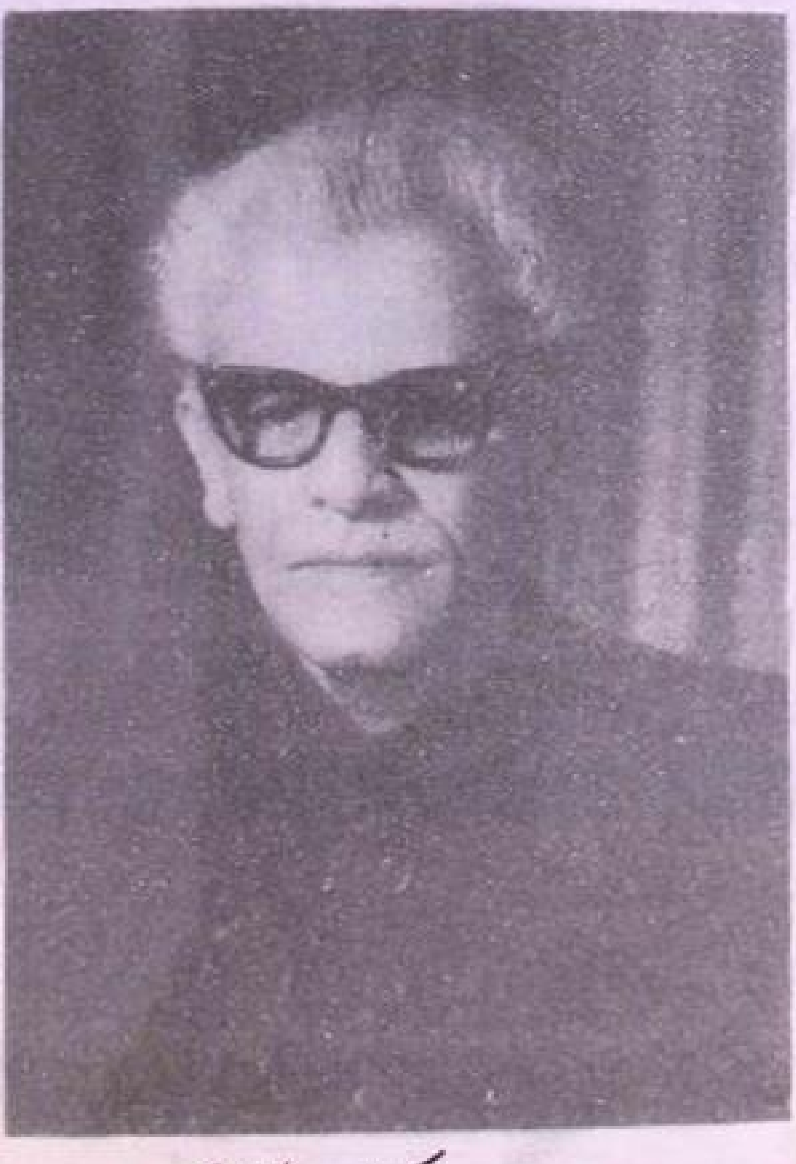
علامہ رضا علی وحشتؔ کے ساتھ



ڈھاکہ ۱۹۵۶ء
ریڈیو پاکستان ڈھاکہ



ڈھاکہ ۱۹۶۷ء
سیکرٹریٹ حکومت مشرقی پاکستان



کراچی ۱۹۷۵ء



کراچی ۱۹۸۴ء

8/B, CAPRI APARTMENTS.
K. D. A. Scheme No. 1
Off. Miran Mohd. Shah Road,
Karachi - 8
Phone: 44 75 49

ویسے تو برادرِ عزیز سید سفیر اعظم نے ریاضی اور انگریزی
میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کئے ہیں لیکن میں
جانتا ہوں کہ فارسی اور اردو زبان و ادب پر بھی انھیں وہی
قدرت حاصل ہے جو ریاضی اور انگریزی پر ہے۔ ان کا مطالعہ
وسیع، ذوقِ شعری معتبر اور مجھ سے تعلقِ خاطر خصوصی ہے
اس لئے میں ان پر اعتماد کرتا ہوں اور بے حد عزیز رکھتا ہوں
اور یہی وہ بات ہے جس کے سبب ہم دونوں کے مابین قرابت
داری سے بھی زیادہ مضبوط رشتہ رفاقت کا ہے جو راز دلی کے ساتھ
قائم رہا اور قائم ہے۔ یہی رفاقت اس اشاعت کی محرک ہے
جس پر میں صاد کرتا ہوں

اقبال عظیم

مرے کریم!

مرے کریم مجھے یہ سزا نہ دینا کبھی
کہ دشمنوں سے مجھے عرضِ حال کرنا پڑے
مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں، مرے معبود!
کہ دوستوں سے بھی کوئی سوال کرنا پڑے

پیکرِ نور

سیرتِ پاکِ محمدؐ کا بیاں کیسے کروں
لوحِ محفوظ کی تحریر کہاں سے لاؤں؟
کیسے سمجھاؤں تمہیں کیا تھے خدوخالِ حضورؐ؟
پیکرِ نور کی تصویر کہاں سے لاؤں؟

مبادا مہرِ خاموشی لگا دی جائے ہونٹوں پر
غزل کو احتیاطاً ہم نے گویائی سِکھا دی ہے

○

میں غزل گو ہوں قصیدہ تو نہیں کہہ سکتا
کیا کروں لہجۂ دربار کہاں سے لاؤں ؟

○

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انھیں بھی نظر نہیں آتا

اُتر کر قصرِ عالی سے ہمارے رُوبرو آؤ
بلندی سے ہمارے قد کا اندازہ نہیں ہوگا

○

ہماری تلخ نوائی تمھیں بُری تو لگی
تمھارا لہجہ بھی کچھ ہم سے مختلف تو نہ تھا

○

آپ کے لہجے میں پندار کی بُو آتی ہے
سرپرستوں کی طرح حال نہ پُوچھا کیجے

جُھک کر سلام کرنے میں کیا ہرج ہے مگر
سر اِتنا مت جُھکاؤ کہ دستار گر پڑے

○

دامانِ توکل کی یہ خوبی ہے کہ اِس میں
پیوند تو ہو سکتے ہیں، دھبّے نہیں ہوتے

○

غم کی توہین تھی ساقی کا سہارا لینا
ورنہ میخانہ بہت دُور نہیں تھا گھر سے

ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے

○

میں زندگی کو سہاروں پہ چھوڑ دوں کیسے
میں جانتا ہوں مآلِ سپردگی کیا ہے

○

تم آج ہمیں غیر سمجھتے ہو تو سمجھو
اوروں سے ملو گے تو ہمیں یاد کرو گے

ہَوا چلے نہ چلے یہ عمل مقدّر ہے
چراغ جو بھی جلے گا کبھی بجھے گا ضرور

مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے
چراغ جب بھی بجھے گا دھواں اُٹھے گا ضرور

خود اپنے گھر میں ہو کوئی کہ صحنِ گُلشن میں
جو حبس ہو گا فضا میں تو دم گھُٹے گا ضرور

تیز قدموں سے چلو اور تصادم سے بچو
بھیڑ میں سست چلوگے تو کچل جاؤگے

○

تم ہو اک زندۂ جاوید روایت کے چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤگے

○

تمھارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گداگروں کی طرح عرضِ مدّعا نہ کرو

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

○

بات تو جب ہے کہ رندوں کا مقدّر بدلے
نام تو ہم بھی بدل سکتے تھے مے خانے کا

○

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں
فقط ساقی بدل جانے سے میخانہ نہ بدلے گا

آپ کے شہر میں رونق تو بہت ہے لیکن
اپنے گھر کے درودیوار کہاں سے لاؤں

○

یہ کیا بتائیں کہ ہم کیا گنوا کے آئے ہیں
بس اک ضمیر بہ مشکل بچا کے لائے ہیں

○

جہاں بھی ہم نے صدا دی یہی جواب مِلا
یہ کون لوگ ہیں، پُوچھو کہاں سے آئے ہیں

یہی جی چاہتا ہے اب گریباں چاک کر ڈالیں
جو ہونا ہے تو رسوائی سرِ بازار ہو جائے

خدا محفوظ رکھے اس گھڑی سے میری غیرت کو
کہ دشمن بھی ترس کھا کر مرا غم خوار ہو جائے

ہم نے گُل کر دیے چراغ اپنے
اب تو بدلے گا رُخ ہواؤں کا

نصیب کیسے بدل دے کوئی سفینے کا
جو ناخدا ہے وہ سب کچھ سہی، خدا تو نہیں

○

حقِّ تنقید تمھیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
جائزہ لیتے رہو اپنے گریبانوں کا

○

صرف رہبر ہی کو ہر بات کا الزام نہ دو
راہ دشوار ہے اور ساتھ ہے نادانوں کا

بُجھا لو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بُجھالی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہوگا نہ فکرِ روشنی ہوگی

○

اگر چراغ بھی روشن نہ کر سکیں گھر کو
تو گھر میں آگ لگا دو کہ روشنی ہو جائے

○

مزاجِ وقت سے تنگ آچکا ہے میرا ضمیر
مِرے اصول بدل جائیں تو عجب بھی نہیں

تم نے خود نور کا ظلمت سے کیا ہے سودا
کرکے توہینِ سحر شام کو الزام نہ دو

○

صبح صادق میں بہت دیر نہیں ہے لیکن
ابھی عجلت میں چراغوں کو بُجھا مت دینا

○

یہ آفتاب کی رونق بھی کتنی دیر کی ہے
قدم بڑھائے چلو، روشنی کا ٹھیک نہیں

اب اس کے ظلم کا شکوہ بھی کس زباں سے کریں
کہ انتخاب تو ظالم کا خود ہمیں نے کیا

یہ تمھاری تلخ نوائیاں کوئی اور سہہ کے دکھا تو دے
یہ جو مجھ میں، تم میں نباہ ہے، مِرے حوصلے کا کمال ہے

ہمیں عادت نہ اب ہے اور نہ تھی فریاد کرنے کی
کبھی تھی بھی تو احساسِ انا ہونے سے پہلے تھی

تسلیم کہ اک شمع کی ضو کم ہے، بہت کم
اک شمع بھی ظلمات میں جلتی ہے بہ مشکل

○

اہلِ محفل یہ بُھلا دیتے ہیں فرطِ شوق میں
گُل بھی ہو سکتی ہیں شمعیں، ٹُوٹ بھی سکتے ہیں ساز

○

تلخیٔ دوراں اپنی جگہ ہے، سعیٔ تبسّم اپنی جگہ
آپ کا آخر کیا منشا ہے، جیتے جی مر جائیں کیا؟

یہ نہ پُوچھیں آپ میرے دل میں کتنے زخم ہیں
اور کتنے تیر ہیں ترکش میں، یہ فرمائیے

ہاتھ کیا، دل بھی مِلا سکتے ہیں ہم اہلِ وفا
آستینوں مگر کیا ہے، دکھاؤ پہلے

ہم نے خود پیدا کیے ہیں زندگی میں مسئلے
ورنہ سچّی بات یہ ہے، مسئلہ کوئی نہیں

دیکھنے کی بات یہ ہے دینے والا کون ہے
ورنہ جو کشکولِ سائل ہے وہی دستِ دعا

○

اپنی حدوں میں تھا تو سمندر عمیق تھا
سیلاب بن کے پھیلا تو پایاب ہو گیا

○

کبھی ہنس بھی دیے تو بے ارادہ
ہم آشفتہ مزاجوں کی ہنسی کیا

گھر کے چراغ بجھ گئے، گھر تو نہیں گرا
جھونکا ہوا کا ہے، کوئی طوفان تو نہیں

وہ خوش نصیب تھے جو سلامت گزر گئے
ورنہ رہِ وفا کوئی آسان تو نہیں

حیرت ہے کہ طوفان سے ہم کیسے گزر آئے
شاید ابھی دنیا کو ضرورت ہے ہماری

اِس دیارِ اجنبی میں لُٹ چکی مدت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ

○

منزل وہی ہے، راہ وہی، راہرو وہی
ہاں یہ ضرور ہے کہ ارادے بدل گئے

○

قدم اُٹھے ہیں تو منزل بھی مِل ہی جائے گی
سفر طویل و مُسلسل سہی، چلے تو چلے

اپنی زباں سے غیر کو بھی کیوں بُرا کہو
دشمن سہی، تعلقِ ہم سائیگی تو ہے

○

آوارہ گردِ شہر کو پتّھر نہ مارنا
آداب آشنا نہ سہی، آدمی تو ہے

○

بھر جائے گا یہ زخم بھی کیوں فکر مند ہو
گہرا تو ہے ضرور مگر زخم ہی تو ہے

جب گھر کی آگ بُجھی تو کچھ سامان بچا تھا جلنے سے
سو وہ بھی ان کے ہاتھ لگا جو آگ بُجھانے آئے تھے

○

جو ہم نے دیکھا ہے آنکھوں سے کیا بتائیں تمھیں
جو تم بھی ہوتے تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیتے

○

ہر آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے ہمارا
دُکھ چاہے کسی کا ہو امانت ہے ہماری

اک آہ تو کر لی ہے مگر سوچ رہا ہوں
پہچان نہ لی ہو مری آواز کسی نے

○

ٹوٹے ہوئے تاروں کو ابھی جوڑ رہا تھا
ہاتھوں سے مِرے چھین لیا ساز کسی نے

○

اک ذرا آہستہ اے نغمہ سرا
ہیں اسی محفل میں کچھ مغموم لوگ

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ مِلا بھی ہے
اس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہُو بولتا بھی ہے

یہ کون لوگ ہیں جو شوقِ سرفروشی میں
لہُو لہُو ہیں مگر مُسکرائے دیتے ہیں

وہ بدنصیب جسے سب ضمیر کہتے تھے
سُنا ہے اس نے کہیں چھُپ کے خودکشی کرلی

○

وہ اب ہوتی تو کتنی کام آتی سارے گلشن کے
جو بیتابی اسیروں میں رہا ہونے سے پہلے تھی

○

جو جاوے ہے کوچے میں ترے آوے ہے گھائل
تلوار کھنچے ہے نہ کوئی تیر چلے ہے

خدشہ فقط نوشتۂ تقدیر سے نہیں
اندیشۂ نوشتۂ دیوار بھی تو ہے

○

ایسے لوگوں سے بھی ہم مِلتے رہے دل کھول کر
جو وفا کے نام پر سوداگری کرتے رہے

○

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کیے
زندہ رہنے کے لئے ہم خودکُشی کرتے رہے

آرزو الزام، شکوہ جُرم، مایوسی گناہ
ہو سزا مقصود تو ستّر بہانے سو جواز

جنوں کی شرطِ اوّل ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اُس کو دیوانہ نہیں کہتے

جہاں ساقی کے پائے ناز پر سجدہ ضروری ہو
وہ بُت خانہ ہے اُس کو رند میخانہ نہیں کہتے

شیوخِ شہر کو تم دیکھ کر پلٹ آئے
کسی سے پُوچھ تو لیتے وہ میکدہ ہی نہ ہو

○

یہ میکدہ تو کل بھی کھُلے گا مِرے بزرگ
اب گھر چلیں حضوُر، بہت رات ہو گئی

○

تمہارے دعویِ ساقی گری کا کیا کہنا
تمہارے پاس ہی بیٹھے ہیں چند تشنہ دہن

دعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈھو فقط دعا نہ کرو

○

خود اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی مانگو
پرائے گھر کے چراغوں کا آسرا نہ کرو

○

کوئی قصداً غرق ہو جائے تو اس کا کیا علاج
اس کو سب الزام دیں گے، کیا خدا، کیا ناخدا

قدم قدم پہ فریبِ نظر چمن کا چمن
نظر غریب بچائے کہاں کہاں دامن

○

زندگی پر اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں
ٹھیک دریا کے کنارے ہے زمینِ کربلا

○

پتھر جو راستے میں پڑے تھے پڑے رہے
کتنے ہی آنکھوں والے ادھر سے گزر گئے

آپ کو ہم جانتے ہیں ہم کو مت بہلایئے
وعدہ کرنا ہے تو کر لیجے، قسم مت کھایئے

تمھیں ناراض ہونے کا سلیقہ بھی نہیں آتا
شکن ماتھے پہ ڈالو اور روکو اس تبسّم کو

وہ جب بھی ذرا روٹھا، چُپ بیٹھے رہے ہم بھی
اک بار منا لیتے تو روز خفا ہوتا

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

پرسشِ حال کی فرصت تمھیں ممکن ہے نہ ہو
پرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں

ہاتھ پھیلاؤں میں عیسیٰ نفسوں کے آگے
درد پہلو میں مِرے ہے مگر اتنا بھی نہیں

○

آخری بار، ہنسی آئی تھی کب، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اس کی تمنّا بھی نہیں

○

اک شکن ماتھے پہ دیکھی تھی تمھارے اک دن
پھر کبھی آنکھ اُٹھا کر تمھیں دیکھا بھی نہیں

اپنے ماتھے پہ بل ڈال کر تم ہمیں شیش محلوں کے اندر سے جھڑکی نہ دو
ہم بھکاری نہیں ہیں کہ ٹل جائیں گے، ہم کو اپنی وفا کا صلہ چاہیئے

○

حد سے بڑھ کر محبت مناسب نہیں، اِس میں اندیشۂ بدگمانی بھی ہے
دشمنوں سے تعلّق تو ہے ہی غلط، دوستوں میں بھی کچھ فاصلہ چاہیئے

○

میری مانو تو اک بات تم سے کہوں، یہ نیا دور ہے اس کا کیا ٹھیک ہے
دوستوں سے مِلو محفلوں میں مگر، آستینوں کا بھی جائزہ چاہیئے

کم سے کم اتنی روشنی یا رب!
ہاتھ کو ہاتھ تو سجھائی دے

○

مجھ کو کرنا ہے زندگی سے نباہ
مجھ کو تھوڑی سی بے وفائی دے

○

عاجزی میری خو نہ بن جائے
مجھ کو توفیقِ خود نمائی دے

پرسش سرِ بازار، شکایت سرِ محفل!
اب آپ کے نزدیک یہ قیمت ہے ہماری

○

مِرے مزاج کا اس میں کوئی قصور نہیں
ترے سلوک نے لہجہ بدل دیا میرا

○

دعائیں مانگتے ہیں جو سحر کی
وہ ناواقف ہیں انجامِ سحر سے

نہ میں کوہکن ہوں، نہ قیس ہوں، مجھے اپنی جان عزیز ہے
مجھے ترکِ عشق قبول ہے جو تمھیں یقینِ وفا نہ ہو

○

کئی وعدے کئے تھے اُس نے مجھ سے صدقِ نیت سے
یہ ساری گفتگو لیکن جُدا ہونے سے پہلے تھی

○

معذرت کرنے کو ہم کرلیں مگر کس بات کی
بے سبب کوئی خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں ہے جن کو
ان غریبوں پہ بھی الزام ہے بینائی کا

○

آپ کے سامنے بیمار نے دم توڑا ہے
اب کبھی نام نہ لیجے گا مسیحائی کا

○

ہم کو حالات نے مجبور کیا ہے ورنہ
ہم فقیروں کا تو معمول دعا دینا ہے

چمکے تو ہے سورج کی طرح حُسن تمہارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے

○

ہم باتیں بھی کر لیں ہیں سرِ بزم کسی سے
آنکھوں سے محبت میں بڑا کام چلے ہے

○

کیسی آہیں، کیسے آنسو، کیسا غم
ہم کو دیکھو کس طرح زندہ ہیں ہم

زہر دے دے نہ کوئی گھول کے پیمانے میں
اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی میخانے میں

○

خود بہ خود کیسے بدل سکتا ہے رندوں کا مزاج
کچھ غلط لوگ چلے آئے ہیں میخانے میں

○

مجھے اس کا کوئی بھی غم نہیں کہ کسی نے مجھ سے وفا نہ کی
میں کسی کے کام نہ آسکا مجھے صرف اس کا ملال ہے

دِلوں کو نور بخشو تاکہ گھر گھر روشنی پھیلے
چراغوں سے اگر ہو بھی تو کتنی روشنی ہو گی

○

رات کے بعد سحر ہو گی مگر کس کے لئے
ہم ہی شاید نہ رہیں رات کے ڈھلتے ڈھلتے

○

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جُھکائے بیٹھے ہیں

غرقاب کر دیا تھا ہمیں ناخداؤں نے
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

○

جو گزر رہی ہے گزار دو، نہ گلہ کرو، نہ بُرا کہو
جو تمھارا حال ہے دوستو، وہی سارے شہر کا حال ہے

○

رہبر و رہزن کا رستہ ایک ہے
کیا خبر کس کے ہیں یہ نقشِ قدم

جو نظر بچا کے گزر گئے مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

○

کچھ سمجھ کر ہی کیا تھا اس نے شہروں سے فرار
ہم ہی دیوانے ہیں شاید، قیس سودائی نہ تھا

○

ڈوبتے دیکھے ہیں ان آنکھوں سے اتنے آفتاب
روشنی کے نام سے بھی اب لرز جاتا ہوں میں

مجھے جو بھی دشمنِ جاں مِلا وہی پختہ کارِ جفا مِلا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا

○

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

○

ان سے کچھ اور چمک جاتی ہے گھر کی ظلمت
اس لئے میں نے چراغوں کو بجھا رکھا ہے

آپ اب پرسشِ احوال کی زحمت نہ کریں
جانے کیا مُنہ سے نکل جائے پریشانی میں

○

آپ نے زحمت نہ فرمائی سمجھنے کی کبھی
ورنہ میری داستاں مبہم نہیں ہے، کم سے کم

○

میرے خلوص پر جو بھروسہ نہ ہو تمھیں
مجھ کو تعلقات پہ اصرار بھی نہیں

نہ رسوائی کا اندیشہ، نہ زحمت لب کشائی کی
جو آنکھیں گفتگو کرتی ہیں میں ان سے مخاطب ہوں

○

تمھارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ پھر چراغ جلے

○

غبارِ وقت نے کچھ یوں بدل دیئے چہرے
خود اپنا شہر بھی مجھ کو نیا نیا سا لگا

آشنا ہوتے ہوئے بھی آشنا کوئی نہیں
جانتے سب ہیں مجھے، پہچانتا کوئی نہیں

○

خودکشی کی بھی سزا ہے، مے کشی کی بھی سزا
کون کس مشکل میں ہے، یہ دیکھتا کوئی نہیں

○

مختصر لفظوں میں یہ ہے اب مزاجِ دوستی
رابطہ سب سے ہے لیکن واسطہ کوئی نہیں

بہت عمیق سہی اور بے کنار سہی
کسی کی پیاس سمندر بجھا نہیں سکتا

○

جو ہم پہ گزری ہے شاید سبھی پہ گزری ہے
فسانہ جو بھی سُنا کچھ سُنا سُنا سا لگا

○

ہم زباں سے کچھ کہیں تو آپ کا شکوہ بجا
کوئی آنسو لب کشا ہو جائے تو ہم کیا کریں

منصب تو ہمیں بھی مِل سکتے تھے لیکن شرطِ حضوری تھی
یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی بس اتنی سی مجبوری تھی

کچھ درد سا ہے تو پہلو میں، پہلے سے لیکن ہلکا ہے
یا دستِ جفا کچھ نازک تھا یا شاید ضرب ادھوری تھی

نظریں بھی ملیں، کچھ لب بھی ہلے، ماتھے پہ شکن بھی اک اُبھری
گو مُنہ سے اُس نے بات نہیں کی بات تو لیکن پوری تھی

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں اک نازک سی دشواری ہے
آغازِ وفا خود ہم نے کیا تھا پہلی بھول ہماری ہے

○

ہم شہرِ وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دِل کی چوٹ چُھپاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

○

میں چاہتا ہوں کہ اپنی زباں سے کچھ نہ کہوں
میں صاف گو ہوں مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

ہم ٹھوکر کھا کر جب بھی گرے رہگیروں کو آواز نہ دی
وہ آنکھوں کی معذوری تھی، یہ غیرت کی مجبوری تھی

○

کچھ دردِ نہاں، کچھ فکرِ جہاں، کچھ شرمِ خطا، کچھ خوفِ سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

○

حالِ دل کہہ دیں کسی سے بارہا سوچا مگر
اس ارادے کو ہمیشہ ملتوی کرتے رہے

احباب مریضِ غم کے لئے کچھ چارہ گروں کو لائے تھے
پھر کیا جانے کیوں لوٹ گئے، دروازے تک تو آئے تھے

○

دکھ تم کو جب جب پہنچا ہے خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے، اب کے تمھاری باری ہے

○

کچھ تلخ حقائق نے معمول بدل ڈالے
اپنوں سے کم آمیزی غیروں سے شناسائی

وہ عہد تھا عشق و جوانی کا، اب عمر ہے سعیٔ تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

یہ ادھورے چاند کی چاندنی بھی اندھیری رات میں کم نہیں
کہیں یہ بھی ساتھ نہ چھوڑ دے ابھی روشنی ہے چلے چلو

جامِ جم سے نگہِ توبہ شکن تک ساقی
پوری رُوداد ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

کوئی کس دل سے کہے رودادِ غم
آپ بھی ہیں آب دیدہ، ہم تو ہم

○

اپنی زباں سے میں نے کبھی کچھ نہیں کہا
پھر بھی مِرے خلوص پہ تنقید کی گئی

○

فکر و اظہار میں ہم حکم کے پابند نہیں
شاعری حسبِ ہدایت نہیں ہوگی ہم سے

اقبال بھائی

اقبال بھائی کے والد صاحب یعنی میرے عمِ محترم سیّد مقبول عظیم صاحب عرشؔ میرے والد صاحب قبلہ خان بہادر سیّد محمدؐ احسان عظیم صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور مجھ پر بطورِ خاص شفقت فرماتے تھے۔ چچا صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے اور جب بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، ازراہِ عنایت اپنے تازہ ترین کلام سے نوازتے تھے اور میرے اسکول (امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ) کے شاندار سالانہ مشاعرہ میں جس میں صفیؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، آرزوؔ لکھنوی، بہزادؔ لکھنوی اور ملک کے نہ معلوم کتنے نامور شعراء رونق افروز ہوا کرتے تھے، بڑے شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ اِن کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے:

بیماری میں آتے تھے وہ روز عیادت کو
اے چارہ گرو میں تو بیمار ہی اچھا تھا

جنّت مکانی چچی صاحبہ کی محبت بھی شفقتِ مادری کو شرماتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ہم سب بھائی بہن و چچازاد اور تایازاد، حقیقی بھائی بہنوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے پر جان نثار کرتے تھے۔

وقار بھائی (پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب مرحوم) چچا صاحب کے فرزندِ اکبر اور اقبال بھائی سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے کے بعد کی یادوں

کے اوّل ترین نقوش میں ان کا برادرانہ شفقت و محبت کا نقش نہایت واضح ہے اور یہی دلی لگاؤ وقار بھائی کو مجھ سے تمام عمر رہا۔

ان دونوں بھائیوں کی درخشاں زندگیاں سارے خاندان کے لئے باعثِ فخر اور بالخصوص میرے اور میرے چھوٹے بھائی سیّد سعید العظیم کے لئے مشعلِ راہ رہیں۔ ہم نے ان کے کردار کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوارنا سیکھا اور اگر راست روی، استقامت اور اولوالعزمی کی یہ روشن مثالیں ہر وقت اور ہر قدم پر ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو آج ہم کسی قابل ہی نہ ہوتے۔

میرے والد صاحب قبلہ نے آج سے ۷۰ سال قبل لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنے آبائی وطن سے کم علاقہ رکھتے تھے۔ میری پیدائش اور تعلیم و تربیت سب کچھ لکھنؤ میں ہی ہوئی اور تقسیم سے قبل تک میں نے صرف لکھنؤ ہی کو اپنے وطن کی حیثیت سے جانا اور پہچانا تھا۔

پچا صاحب مرحوم بھی پینشن لینے کے بعد لکھنؤ ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ لہٰذا ہماری بچپن سے لے کر تقسیم سے چند سال بیشتر تک کی بہترین یادیں لکھنؤ ہی سے وابستہ ہیں۔

رات کو دس بجے کے بعد میں پڑھنے لکھنے سے اور اقبال بھائی پڑھانے لکھانے سے فارغ ہوتے تھے تو ہماری علمی، ادبی اور تفریحی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ کیا کیا علمی بحثیں، نکتہ سنجیاں اور موشگافیاں ہوا کرتی تھیں۔ کیسے کیسے لطائف و ظرائف بیان ہوتے تھے۔ کیسے کیسے فلک شگاف نعرے لگائے جاتے تھے اور ان محفلوں کی روحِ رواں اقبال بھائی ہوا کرتے تھے۔

یہ تو آپ نے جان لیا کہ میں اور اقبال بھائی کس طرح ایک ہی تربیتی ماحول سے گزر کر اس عمر کو پہنچے ہیں لیکن یہ راز کہ وہ باقاعدہ شعر بھی کہتے ہیں، سب سے پہلے ظاہر اس وقت ہوا

جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انہیں آج جو شہرت، مقبولیت اور عزت حاصل ہے اس کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں اور ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ یہ سب کچھ فی الحقیقت ماحصل ہے اس طویل وصبر آزما سفر کا جس کا آغاز اب سے پچاس سال پہلے لکھنؤ کی ایک شعری نشست سے ہوا۔ یہ طرحی مشاعرہ اقبال بھائی کا پہلا اہم مشاعرہ تھا، جس میں لکھنؤ کے قریب قریب تمام اکابرِ سخن شریک تھے۔ نرم ونازک لہجے میں چھوٹی سی رومانی غزل اور اس پر اقبال بھائی کا سحر انگیز ترنم، ساری محفل میں شعلے لپک گئے۔ تمام شرکائے محفل ایک خوشگوار استعجاب کے ساتھ اقبال بھائی کا منہ تک رہے تھے اور ہر شخص کی آنکھوں سے ایک ہی سوال جھانک رہا تھا، جس کا جواب محفل میں شریک صرف دُو بزرگوں کے پاس تھا۔ لیکن وہ دونوں بزرگ اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم بکھیرے مصلحتاً خاموش بیٹھے تھے۔ میری مراد حضرت عبدالباری آسی الدنی اور حضرت قدیر لکھنوی سے ہے، جن کی تحریک پر والد صاحب کی اجازت سے اقبال بھائی نے اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ غزل کا ایک شعر اب تک ذہن میں محفوظ ہے:

کوششیں کر رہا ہوں ہنسنے کی
اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں

اس رات محفل میں جو کچھ ہو رہا تھا اور اس کے بعد جس سرعت کے ساتھ اقبال بھائی ادبی محفلوں میں موضوعِ گفتگو بن گئے میری توقعات سے مختلف ضرور تھا لیکن اس انکشاف پر مجھے کچھ زیادہ حیرت بھی نہ تھی اس لئے کہ ہمارے دادا صاحب قبلہ، اقبال بھائی کے نانا صاحب قبلہ اور ان کے والد محترم اپنے اپنے عہد کے مستند شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اگر اقبال بھائی اپنی اس خاندانی روایت کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہے تھے تو اس کا انھیں پورا حق پہنچتا تھا بلکہ

یہ ان کا فرض تھا اور اس فرض کو انھوں نے کس پُر وقار طریقے سے پورا کیا، کسی سے پوشیدہ نہیں۔ توقعات سے مختلف ہونے کی بات میں نے اس لئے عرض کی کہ جس زمانے کی یہ بات ہے، اس زمانے میں انگریزی کے ناول پڑھنا، انگریزی فلم دیکھنا، انگریزی میں مضامین لکھنا اور پُرانی کتابوں کی دکانوں سے اپنے ذاتی کتب خانے کے لئے انگریزی کے شاہکار خریدنا اقبال بھائی کے محبوب ترین مشاغل تھے۔ جبکہ ایم۔ اے کرنے کے لئے بھی انھوں نے انگریزی ہی کا انتخاب کیا تھا، اُردو کا نہیں۔ ان باتوں کے پیشِ نظر یہ گمان نہ تھا کہ وہ یک بیک اُردو شعر و ادب کی جانب رجوع ہو جائیں گے۔ یقیناً جو کچھ ہو رہا تھا قدرت کے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن معاملہ ایک اٹل ارادوں والے نوجوان کا تھا جسے راہِ راست پر لانے کے لئے قدرت کو بڑی بے دردی سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ پہلی بجلی اقبال بھائی پر اس وقت گری جب بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوتے ہی دو۲ مہینوں کے اندر والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں کا انتقال ہو گیا اور سات چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آپڑا۔ بڑے بھائی یعنی پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم کی مجبوری یہ تھی کہ انھیں الہ آباد یونیورسٹی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پہلے ہی طلب کر چکی تھی اور گھر کے اخراجات کے معاملے میں ایک حد سے آگے ہاتھ بٹانا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ کیا اعزّا اور کیا ہمسائے سب ایک دوسرے سے یہی سوال کرتے تھے کہ بائیس۲۲ سالہ ناپختہ نوجوان اتنا بھاری بوجھ کیسے اُٹھا سکے گا؟ لیکن دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دُبلے پتلے پیکر میں چھپا ہوا ایک مردِ آہن کس طرح یک بہ یک نمودار ہوا اور کچھ جرأت مندانہ فیصلے اقبال بھائی کے حوالے کر گیا۔ یونیورسٹی کا بستہ سپردِ طاق ہوا اور ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ میں داخلے کی پیشکش قبول کر لی گئی تاکہ مختصر سے مختصر مدّت میں مستقل ذریعۂ معاش ہاتھ آئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں اتوار کے علاوہ باقی دنوں میں صبح ۶ بجے سے رات کے دس بجے تک اقبال بھائی تھے اور ان کی سائیکل، دس بجے سے چار بجے شام تک ٹریننگ کالج اور باقی اوقات میں پرائیویٹ ٹیوشن۔ کھانا میسّر آتا تھا شام کو پانچ بجے جبکہ تحویل میں ہوتے تھے صرف دو جوڑے کپڑے، ایک بدن پر اور ایک گھر ہی میں دُھلنے کے بعد الگنی پر۔ ایک مرتبہ نہ معلوم کس رَو میں ان کی زبان سے یہ جملہ بھی نکل گیا تھا کہ "آج کل ہمارے گھر میں باورچی خانہ نہیں ہے، رسوئی گھر ہے" مطلب صاف ظاہر تھا کہ گزر اوقات سبزی اور دال پر ہے۔ آزمائش کے انھیں دنوں میں ایک جوان بہن بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نہ کبھی ان کے ماتھے پر شکن اُبھری نہ چہرے پر تھکن کے آثار نمودار ہوئے، نہ زبان پر حرفِ شکایت آیا، نہ کسی سے تقدیر کا رونا رویا گیا اور نہ کہیں دستِ سوال دراز ہوا۔ جہاں کہیں ملے مُسکراتے ہوئے ملے جیسے دنیا بھر کی طمانیت اِنہی کے حصّے میں آگئی ہو۔ آج انھیں یہ شعر پڑھتے سُنتا ہوں تو ان کی اُس وقت کی مُسکراہٹ یاد آجاتی ہے۔

غم غلط کرنا کوئی مشکل نہیں
انتقاماً مُسکرانا چاہیئے

غرض خدا خدا کر کے ٹریننگ کالج کا مرحلہ انجام کو پہنچا اور عارضی طور پر اقبال بھائی گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے منسلک ہوگئے ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے وابستگی ہوئی۔ "ترقی" نامی ایک ہفت روزہ اخبار کی ادارت بھی سنبھالی اور ٹیوشنوں کا سلسلہ بھی بدستور جاری رہا۔ والدین اور کچھ ہی دنوں بعد ۱۵، ۱۶ سال کی ایک بہن کے انتقال نے جو زخم لگائے تھے بہت گہرے تھے جنھیں مندمل ہونے کے لئے وقت درکار تھا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور مالی حالات قابو میں آتے گئے بھائی بہنوں کے

ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹیں نمودار ہونے لگیں۔ جہاں تک اقبال بھائی کا تعلق تھا وہ ان مسکراہٹوں کے درمیان ٹریننگ کالج سے ایک تازہ زخم ساتھ لے کر لوٹے، جس کا تعلق ایک پُر وقار رومان سے تھا۔ اگر اس رومان کی داستان بیان کی جاسکتی تو اقبال بھائی کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو واضح ہوسکتا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس داستان کو ماضی کی ایک مقدّس امانت سمجھتے ہیں جسے کسی اور کے حوالے کرنا انھیں گوارا نہیں، اِس لئے میں بھی چُپ ہوں۔ تاہم اس قدر اشارہ ضرور کرنا چاہوں گا کہ شاید یہی وہ رومانی تجربہ ہے جس نے اقبال بھائی کی فطری خود داری کو احساسِ انا عطا کیا۔ وہ انا جو آج تک ان کی شخصیت اور شاعری کا عنصرِ غالب ہے۔

مختصر یہ کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کا زمانہ جہاں ان کی سخت ترین آزمائش کا زمانہ تھا، وہیں ان کے مستقبل کے لئے دور رس نتائج کا حامل بھی ثابت ہوا، اس زمانے کے متعلق خود اقبال بھائی نے ایک جگہ کیا تحریر کیا انھیں کے لفظوں میں سُن لیجئے:

> "یہ زمانہ میرے لئے سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ کشتی کس طرح کنارے لگی اس کی تفصیل کے لئے نہ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ وہ تفصیل سُن کر آپ خوش ہوں گے۔ اس لئے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مختصر سا یہ دور میرا سب سے بڑا معلّم ثابت ہوا جس نے میرے مزاج کو وہ پندار اور ارادوں کو وہ پختگی عطا کی جس نے بعد کی زندگی میں ہر قدم پر مجھے سہارا دیا۔"

۱۹۳۹ء کی حد میں نے اس لئے قائم کی کہ اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول ہمیر پور کے لئے اقبال بھائی کو مستقل سرکاری ملازمت کا پروانہ مِل گیا، جو ان کی قوتِ فیصلہ کا

کا دوسرا بڑا امتحان تھا، اس لئے کہ اوّل تو انھیں لکھنؤ سے عشق تھا اور اس کی گلیوں سے جدائی انھیں کسی قیمت پر قبول نہ تھی، دوسرے یہ کہ لکھنؤ کے چھوڑنے سے بھائی بہنوں کے لئے کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے تھے۔ جذبات اور فرائض کے مابین گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن جیت اسی مردِ آہن کی ہوئی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فیصلہ ہمیر پور کے حق میں ہوا۔ باقی دو بہنوں میں سے ایک کی شادی کر دی گئی، دوسری بہن کو اس کے اصرار بعد پر گرلز نارمل اسکول، الہ آباد میں داخل کر دیا گیا جہاں بڑے بھائی موجود تھے اور چھوٹے بھائیوں کو نانا کے پاس میرٹھ روانہ کر دیا گیا۔ بچّوں کی کفالت کا انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوا کہ میرٹھ میں والد صاحب کا چھوڑا ہوا مکان فروخت کر کے بچّوں کے حصّے کی رقم سرکاری خزانے میں داخل کی گئی اور نانا صاحب ان کے ولی مقرر ہوئے۔ بظاہر یہ سارا انتظام اطمینان بخش تھا۔ لیکن جب لکھنؤ چھوٹا ہوگا اور گھر کا شیرازہ اس طرح بکھرا ہوگا تو کون جانے کہ اقبال بھائی کے دل و دماغ پر کیا قیامت گزر گئی ہوگی بہرحال مصلحتِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اقبال بھائی نئی مہم پر روانہ ہو گئے اور ہمیر پور جا پہنچے۔

اب کا حال معلوم نہیں لیکن جب اقبال بھائی وہاں پہنچے تو ہمیر پور ایک عجیب و غریب قسم کی بستی تھی، جسے نہ شہر کا نام دیا جا سکتا تھا، نہ قصبے کا، نہ گاؤں کا۔ ایک طرف دریائے جمنا، دوسری طرف دریائے بیتوا اور دونوں دریاؤں کے درمیان سطحِ سمندر سے سیکڑوں فٹ کی بلندی پر ۳۰، ۳۵ ہزار نفوس کی آبادی تھی اور بس۔ کہنے کو ڈویژن کا صدر مقام تھا لیکن وہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن تھا کانپور، جو چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اِس بستی میں نہ بجلی تھی، نہ

پانی کا نل، نہ بس، نہ ٹرک، نہ رکشا، نہ موٹر، نہ گھوڑا گاڑی اور نہ کوئی باقاعدہ بازار۔ اسکول، اسپتال، کچہری اور پولیس اسٹیشن کے علاوہ اگر وہاں کوئی اور قابلِ ذکر پختہ عمارت تھی تو وہ بنگلہ تھا جس کے آدھے حصّے میں ڈپٹی کمشنر رہتا تھا اور آدھے حصّے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ اسکول کی عمارت کہا جاتا تھا کہ کبھی شیواجی کے گھوڑوں کے لئے اصطبل کا کام دیتی تھی۔ باغ، کھیت اور پارک تو درکنار تاحدِ نظر سبزے کا نام نہ تھا۔ پوری بستی میں صرف ایک درخت تھا جسے اندازاً آم کا درخت سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ اس میں کوئی پھل کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ سبب اس ویرانی کا یہ تھا کہ وہاں کی پتھر جیسی سخت مٹی میں لوہے کی آمیزش تھی۔ ایک آدمی پانی ڈالتا جاتا تھا اور دوسرا کدال سے کھودتا جاتا تھا، تب کہیں چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں قبر تیار ہوتی تھی۔ کنویں وہاں اتنے گہرے ہوتے تھے کہ گاڑی بھر رسّی لگتی تھی اور شرفا عام طور پر اپنے بچّوں کے ساتھ مِل کر اپنا اپنا پانی خود بھرتے تھے۔ نہانے دھونے کے لئے ایک چھوڑ دو دو دریا تھے۔ دریائے جمنا پر کشتیوں کا ایک عارضی پُل تھا جس سے گزر کر بس کے ذریعے خریداری کے واسطے کانپور کا سفر کرنا پڑتا تھا یعنی آمد و رفت اسّی ۸۰ میل، خریداری کی خریداری، سیر کی سیر جسے وہاں کے لوگ ترستے تھے۔ ۶، ½۶ فٹ کے قد اور ۸، ۹ فٹ لمبی لاٹھیاں وہاں ایک عام منظر تھا۔ نویں دسویں جماعت کے طلباء بھی اپنے بیشتر اساتذہ سے زیادہ قد آور ہوتے تھے جبکہ کھیتوں میں کام کرنے والی دیو قامت عورتیں پاؤں میں موٹی موٹی جھانجھیں پہنتی تھیں۔ اس لئے کہ وہاں سانپ بکثرت ہوتے تھے اور بہت زہریلے ہوتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ جھانجھوں کے شور سے سانپ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

غرض اقبال بھائی کی جگہ لکھنوی مزاج کا کوئی اور نوجوان ہوتا تو کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاتا یا دونوں دریاؤں میں سے کسی ایک میں ڈوب مرتا لیکن اقبال بھائی نے اس جنگل میں بھی منگل منا کر دکھا دیا جس کی داستان بے حد دلچسپ اور طویل ہے۔ اور تو اور انھوں نے اسی ویرانے میں جہاں ۶۰، ۶۰، ۷۰ برس کے پڑھے لکھے بزرگوں نے کبھی آنکھوں سے ریل گاڑی تک نہیں دیکھی تھی۔ اقبال بھائی نے ایک محفلِ شعر و سخن کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ ہمیر پور میں ڈھائی سالہ قیام کی حیرت انگیز داستان اور اس عجیب و غریب مشاعرے کی روداد میں بیان کروں گا تو بات نہیں بنے گی، خود انھیں سے سُنیئے گا تو لطف بھی آئے گا ،وراس بات کا اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اقبال بھائی کو ہر حال میں زندہ رہنے کا سلیقہ آتا ہے اور دُھن سوار ہو جانے کی صورت میں ناممکن کو ممکن کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

مختصر یہ کہ اس ریگزار میں خلوص و محبت کے پھول کِھلا کر اور اہلِ ہمیر پور کو آب دیدہ چھوڑ کر اقبال بھائی اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے جو ۳۹ء سے اوائل ۵۰ء تک ہندوستان میں، اگست ۵۰ء سے فروری ۷۰ء تک مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں، کہساروں اور وادیوں کے درمیان جاری رہا اور پچھلے چودہ ۱۴ برسوں سے اس سفر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ کراچی میں مقیم ہیں لیکن ماشاء اللہ ابھی تھک کر نہیں بیٹھے ہیں اس لئے کہ معذوریٔ چشم کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سعودی عرب اور امارات تک ان کی پرواز کی زد میں ہیں اور اس طرح ہیں کہ خود انھیں کے بقول :

۸۲

قدم قدم پہ مرتب ہوا ہے افسانہ
جدھر جدھر سے گزرتا گیا ہے دیوانہ

یہ صحیح ہے کہ قدم قدم پر مرتب ہونے والے انھیں افسانوں کا نام اقبال بھائی کی سوانح عمری ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لکھنے بیٹھے تو بے شمار سوالات کا ہجوم قلم کو آگھیرتا ہے اور ان سوالات کا احاطہ کرنا، انھیں ترتیب دینا اور ان کے جوابات فراہم کرنا ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر :

تسلسل کے ساتھ انھوں نے والد صاحب، والدہ صاحبہ، تین بھائیوں، چار بہنوں، ایک بیٹے اور اہلیہ کے انتقال کو کس جگر داری سے انگیز کیا ؟ بینائی کے زیاں کو کس شکر گزاری کے ساتھ قبول کیا ؟ والدین کے انتقال کے بعد مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کے باوجود لکھنؤ میں سات بھائی بہنوں کی اور اہلیہ کے انتقال کے بعد معذوریٔ چشم کے باوجود تین چھوٹے چھوٹے بچّوں کی پرورش انھوں نے کیسے کی ؟ ایک پستول کی گولی سے وہ بال بال کیسے بچے ؟ ایک کالرا کے بھرپور حملے سے جانبر ہونے کی انھیں کیا قیمت ادا کرنا پڑی ؟ ایک بار موٹر کار کے، دوبار آٹو رکشا کے سنگین حادثات کے بعد اور دوبار مشرقی پاکستان کے تباہ کن سائیکلون کی زد میں آجانے کے بعد انھیں اور ان کے بچّوں کو دوبارہ زندگی کیوں کر ملی ؟ مشرقی پاکستان کے خونی انقلاب سے گزر کر وہ بچّوں سمیت بخیریت کراچی کیسے پہنچے ؟ بے سروسامانی کے عالم میں دوسری مہاجرت کے کون کون سے تلخ تجربات پیش آئے ؟ احباب اور اعزا کے اصرار اور پُرکشش تجاویز کے باوجود انھوں نے دوسری شادی کیوں نہیں کی ؟ ایک آسیب زدہ مکان میں ان پر کیا گزری ؟ ایک دفعہ نئی سائیکل اور دوسری مرتبہ اہلیہ کا زیور انھیں کیوں

فروخت کرنا پڑا ؟ ایک بار ۲۶ میل پاپیادہ، دوسری مرتبہ ۷۰ میل سائیکل پر اور تیسری بار سیلاب کے زمانے میں مسلسل ۱۶ گھنٹوں تک کشتی پر سفر کرنے کی ضرورت انھیں کیوں پیش آئی ؟ مشرقی پاکستان میں اُردو کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں انھیں کن تجربات سے گزرنا پڑا ؟ ایک متعصب سرجن نے ان کی آنکھ کا آپریشن دیدہ و دانستہ کیوں خراب کیا ؟ معذوریٔ چشم کے باوجود حکومتِ مشرقی پاکستان کی دستاویزی کتب کے لئے ۱۹ اضلاع کی لسانیات و ادبیات سے متعلق انگریزی زبان میں تحقیقی مقالات کیسے مرتب کرائے ؟ پرائیویٹ امیدوار ہونے کے باوجود آگرہ یونیورسٹی سے منزلوں دُور رہ کر انھوں نے ایم. اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کا اعزاز کیسے حاصل کیا ؟ جبکہ مقابلہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور مخمور اکبر آبادی جیسے پُختہ کار اہلِ قلم سے تھا، وہ کون سی قوت تھی جس کے سہارے والدہ صاحبہ کے انتقال کے دن انھوں نے ٹریننگ کالج کے سالانہ پریکٹیکل امتحان میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی ؟ ہندوستان میں متعصب شرکائے کار کی خطرناک سازش، مشرقی پاکستان میں ایک نامور اور با اختیار ادیب و شاعر کی منظم محاذ آرائی اور بعد میں کچھ حاسدین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کیسے ظفر نصیب کیا ؟ انہی آنکھوں کے ساتھ تین بار آستانِ رسولؐ پر حاضری کیوں کر ممکن ہوئی ؟ بیاض کے بغیر تین شعری مجموعے یاداشت کے سہارے کیسے مدوّن ہوئے، کیسے چھپے ؟ اور کس کس انداز سے ان کی پذیرائی ہوئی !

یہ اور ان جیسے کتنے جواب طلب سوالات ہیں، سبق آموز اور عبرتناک سانحات ہیں، اپنی اور پرائی رومانی داستانیں ہیں، عہدِ شباب کے بے تعبیر خواب اور

ناگفتہ فسانے ہیں، بدلتے ہوئے ماحول کے منظر نامے ہیں، انسانی کردار کے غیر معمولی نمونے ہیں، مشاعروں اور شاعروں کی عجیب و غریب حکائتیں ہیں، مشاہیرِ سخن کی نجی زندگی کے رموز ہیں، شخصیات کے خاکے، نفسیاتی مشاہدے ہیں، رُلا دینے اور ہنسا دینے والے تجربات ہیں، دوستی اور قرابت داری کی کرم فرمائیاں ہیں، لطیفے ہیں، شگوفے ہیں، چٹکلے ہیں، نوادرِ سخن ہیں اور خدا جانے کیا کیا کچھ ہے جس سے ان کی زندگی ترتیب پاتی ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال بھائی ۵۰، ۶۰ سال پر محیط ایک چلتا پھرتا سفر نامہ ہیں اور ان کی رودادِ حیات ایک چھوٹی موٹی طلسم ہوش رُبا جس کے بیان کو ایک الگ کتاب درکار ہے میں نے کچھ اشارات فراہم کر دیے ہیں باقی آپ جانیں اور اقبال بھائی، وہ گھنٹوں گفتگو کرتے رہیں اور آپ دم بخود سُنتے رہیں اگر کسی منزل پر جی اُکتا جائے تو میرا ذمہ!

سیّد شید اعظیم

(۸۵)

اقبالؔ بھائی کے پہلے مجموعۂ غزلیات
مضرابؔ میں شامل
ان کے خود نوشت پیش لفظ سے
ایک اقتباس

میں نے مشرقی پاکستان میں اپنی زندگی کے بیس سال اُردو زبان کے ایک رضاکار کی حیثیت سے گزرے اور میری تمام علمی اور ادبی صلاحیتیں اس صوبے میں صرف اُردو زبان و ادب کے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کی کوششوں میں صرف ہوئیں۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر میں نے لکھنے پڑھنے کا جو کچھ بھی کام کیا سب کا سب اسی مقصد کے تحت کیا۔ اس مجموعے کے علاوہ جو اس وقت آپ کے سامنے ہے اور جس کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان میں تخلیق ہوا، میری ایک کتاب 'مشرقی بنگال میں اُردو' ہے جو ۱۹۵۴ء میں چاٹگام سے شائع ہوئی۔ یہ فی الحقیقت میرا نامکمل تحقیقی مقالہ ہے جسے میں نے کتابی شکل دی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں مشرقی پاکستان میں اُردو زبان و ادب کی دو صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ پیش کی گئی ہے اور اس کتاب کا بیشتر مواد علمِ سینہ ہے جو دو برس کی دوڑ دھوپ کے بعد وہاں کے بزرگوں کے تعاون سے اور حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کی قلمی تصنیف "ثلاثہ غسالہ" کی مدد سے مرتب کیا گیا۔ حکیم ناطق لکھنوی مرحوم اس امید میں کلکتے سے چاٹگام تشریف لے گئے تھے کہ ایک اسلامی مُلک میں اُن کی قدر و قیمت پہچانی جائے گی اور اُن کا دیوان جو ایک مدت سے

منتظرِ طباعت تھا شائع ہو سکے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور حکیم صاحب چاٹگام ہی میں انتقال فرما گئے۔ مجھے اس بات کا علم ہوا، میں نے مسودہ حاصل کر کے اُسے مرتب کیا اور اُن کے صاحبزادے سید رشید احمد صاحب کے تعاون سے دیوانِ ناطق کے نام سے شائع کیا۔

میں نے "سات ستارے" کے نام سے ایک اور کتاب خاص طور پر بنگالیوں کے لئے لکھی جس میں پاکستان کے سات معماروں کی زندگی کے حالات بہت آسان زبان میں درج کیے گیے ہیں۔ اسی طرح مرکزی حکومت کی فرمائش پر ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کی معیت میں ایک اور کتاب لکھی جس میں مشرقی پاکستان کی تاریخی، معاشرتی تہذیبی ثقافتی اور ادبی زندگی سے متعلق چھوٹے چھوٹے دلچسپ مضامین آسان زبان میں ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں صوبائی سکریٹریٹ نے میری خدمت عاریتاً حاصل کی اور وہاں ایک ریسرچ افسر کی حیثیت سے میں نے اس صوبے کے اُنیس ۱۹ اضلاع سے متعلق اُردو، فارسی اور عربی ادبیات پر انگریزی زبان میں ابواب لکھے۔ ڈھاکہ اور چاٹگام کی کتابیں میرے سامنے شائع ہو گئی تھیں باقی کا اللہ جانے کیا ہوا۔ ان ابواب میں بہت سا مواد ایسا تھا جو میری کتاب میں شامل نہیں، اس لئے اُس کے زیاں کا رنج ہے لیکن رنج کرنے سے بھی کیا حاصل کہ ذکر جس جگہ کا ہے اب وہاں نہ مشرقی پاکستان ہے اور نہ اُردو۔

اِس سلسلے میں کچھ کام میں نے اور بھی کیے مثلاً بنگلہ ترقیاتی بورڈ کی جانب سے ایک "بنگلہ اُردو لغت" شائع کیا گیا جس کے حصۂ اُردو کی تصحیح و ترتیب کا کام میرے سُپرد تھا۔ پروفیسر سعد مُنیر مرحوم اور مولانا عبد الرحمٰن بیخود نے خاصی بڑی تعداد میں بنگلہ افسانوں کے ترجمے اردو میں کیے جو سرکاری سطح پر کتابی شکلوں میں شائع ہوئے۔ اِن

کتابوں پر نظرِ ثانی اور اُن کی ترتیب کا کام بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ جناب سید محمد عباس اُس زمانے میں وہاں کسٹم کلکٹر تھے اور ایک ادبی تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ اس کتاب پر نظرِ ثانی کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ یہ کتاب بعد میں 'سفینۂ غزل' کے نام سے شائع ہوئی۔ ڈھاکہ سے اردو کا ایک معیاری ماہ نامہ "خاور" ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوا۔ میں اس منصوبے کے محرکوں میں شامل تھا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا شریکِ کار۔ ڈھاکہ سے بنگلہ زبان کا ماہ نامہ "دِل رُبا" اور چاٹگام سے اسی زبان کا ہفت روزہ رسالہ "زمانہ" شائع ہوتا تھا۔ دونوں مدیروں سے میرے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے میری تحریک پر اِن جرائد کے اُردو ایڈیشن شائع کیے جن کی ترتیب و تدوین کا کام بھی میں نے سنبھالا۔ ڈھاکہ کالج میگزین میں حصۂ اُردو کا اضافہ کرایا اور چاٹگام کے میڈیکل کالجوں سے بھی میں نے اُردو کے رسائل شائع کرائے۔ شروع سے آخر تک میں انجمن ترقی اُردو کی مجلسِ انتظامیہ سے وابستہ رہا اور نائب صدر و صدر کی حیثیت سے حسبِ توفیق مجھ سے جو کچھ ہو سکا کرتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں اُردو کے مسائل نیز وہاں کی نئی اور پُرانی شخصیتوں اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق میرے مضامین ادبِ لطیف، ماہِ نو، مہرِ نیم روز، نو رنگ، نگار (پاکستان) اور خاور وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ میں نے بعض بنگلہ افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی کیے اور بنگالی ادیبوں کو اُردو سے بنگلہ میں ترجموں پر آمادہ کیا۔ غرض وہاں کی زندگی کا ہر لمحہ اسی لگن اور دُھن میں صرف ہوا لیکن افسوس کہ وہ تمام کوششیں ضائع ہو گئیں۔ یہ سوچ کر بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ جس دیس میں قائدِ اعظمؒ کے اس ارشاد کے بعد کہ:

"پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی"

گھر گھر بنگالی بچّوں کو اُردو کی تعلیم بڑے شوق و ذوق سے دی جاتی تھی، جہاں نمازِ جمعہ کے خُطبے، نکاح اور میلاد میں اُردو زبان کا استعمال لازمی سمجھا جاتا تھا، جہاں اُردو کے اخباروں سے پُڑیاں بنانا گناہ تھا، جہاں پورے صوبے پر پھیلے ہوئے بے شمار مکتبوں اور مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اُردو تھی، جہاں گھروں اور بازاروں میں ریڈیو پر صرف اُردو کی غزلیں اور گانے سُنے جاتے تھے، جہاں ہر سینما ہاؤس میں صرف اُردو کا فلم دکھایا جاتا تھا، جہاں ہر چھوٹا بڑا اُردو سیکھنے کی جستجو میں تھا، جہاں بنگالی ادیبوں نے اُردو کی درجنوں کتابوں کے ترجمے بڑے خلوص کے ساتھ بنگلہ زبان میں کیے، جہاں دو صدیوں سے خالص بنگالی ادیبوں کے ہاتھوں اُردو کی تالیف و تصنیف کا کام جاری تھا، جہاں یومِ اقبال اور یومِ استقلال کے جشن بنگالی اداروں کی طرف سے بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے اور جہاں اُردو کو آسمانی زبان تصوّر کیا جاتا تھا، وہیں اُردو کی بے گور و کفن لاش کو بے دردی کے ساتھ پیروں تلے روندا گیا، اُردو والوں کا قتلِ عام ہوا، اُن کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، اُن کے بچّوں کو جیتا جاگتا نیزوں پر بلند کیا گیا، اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا اور اُنھیں اس طرح دیس نکالا دیا گیا کہ اب وہاں اُردو کا نام لیوا کوئی نہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور اس المناک صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے، بہت بڑے سوال ہیں جن کا جواب سوائے اس کے اور کیا دوں کہ:

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں"

(پہلے مجموعۂ غزلیات "مضراب" کے پیش لفظ سے اقتباس)



مرتبِ کتاب

سیّد شیدا اعظیم

پیدائش : لکھنؤ ۲۹ / مئی ۱۹۱۷ء

تعلیم : ایم۔اے۔ ریاضی، لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۴۲ء

ایم۔اے۔ انگریزی۔ بمبئی یونیورسٹی ۱۹۴۶ء

ملازمت : ۱۔ بہاؤالدین کالج جوناگڑھ۔ لیکچرر ریاضی ۱۹۴۵ء،۱۹۴۶ء

۲۔ اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی ۱۹۴۶ء ۔ ۱۹۴۷ء

۳۔ زمیندار کالج گجرات، پاکستان۔ لیکچرر، سینئر لیکچرر، " پرنسپل ۴۷ء تا ۱۹۵۴ء

۴۔ گرلز کالج گجرات ۔ اسسٹنٹ پروفیسر ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء

۵۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال سینئر ماسٹر اِن انگلش، ہاؤس ماسٹر ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۸ء

۶۔ کیڈٹ کالج پٹارو۔ سینئر ہاؤس ماسٹر، " پرنسپل۔ ڈائریکٹریٹ آف اسٹڈیز۔

۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۵ء

۷۔ پاکستان میرین اکیڈمی کراچی۔ اکیڈمک انسٹرکٹر۔ انگریزی و ریاضی ۱۹۷۵ء تا حال

۸۔ پاکستان اسٹیل ملز۔ ایجوکیشنل ایڈوائزر ۱۹۸۲ء تا حال

تازہ غزلیں

سنہ ۱۹۸۰ تا سنہ ۱۹۸۹ء

غزلیں

(قافیہ اور ردیف)

۱-

نوٹ :- قطعات غلط جگہ شامل ہو گئے ہیں (معذرت)

○

گلہ تو آپ سے ہے اور بے سبب بھی نہیں
مگر ارادۂ اظہار زیرِ لب بھی نہیں

میں چاہتا ہوں کہ اپنی زباں سے کچھ نہ کہوں
میں صاف گو ہوں مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

جفا کی طرح مجھے ترکِ دوستی بھی قبول
ملال جب بھی نہ تھا مجھ کو اور اب بھی نہیں

گزر گیا وہ طلب گاریوں کا دَور بہ خیر
خدا کا شکر کہ اب فرصتِ طلب بھی نہیں

مزاجِ وقت سے تنگ آچکا ہے میرا ضمیر
مرے اصول بدل جائیں تو عجب بھی نہیں

گئے دنوں کا فسانہ ہے اب ہمارا وجود
وہ محفلیں بھی نہیں ہیں وہ روز و شب بھی نہیں

جواب دوں گا میں کچھ مجھ سے پوچھ کر دیکھو
ابھی میں ہوش میں ہوں، ایسا جاں بلب بھی نہیں

حسب نسب کی جو پوچھو تو شجرہ پیش کروں
خطاب کوئی نہیں ہے مرا، لقب بھی نہیں

○

بے سبب شکوۂ حالات میں کیا رکھا ہے
ہم نے حالات میں خود زہر ملا رکھا ہے

غم سے شکوہ ہے مجھے اور نہ وجوہِ غم سے
مجھ کو غم خواروں نے دیوانہ بنا رکھا ہے

ایک موہوم سی امید ہے بنیادِ حیات
اک دیا زد پہ ہواؤں کی جلا رکھا ہے

ان سے کچھ اور چمک جاتی ہے گھر کی ظلمت
اس لئے میں نے چراغوں کو بجھا رکھا ہے

وہ سُنے گا تو اُسے مفت ندامت ہو گی
حالِ دِل میں نے اِسی ڈر سے چھپا رکھا ہے

فکر یہ ہے کہ یہ پھولوں سے بچے گا کیسے
میں نے کانٹوں سے تو دامن کو بچا رکھا ہے

اُس کے وعدہ کا مجھے پاس ہے اُس کو نہ سہی
میں نے راتوں کو بھی دروازہ کھُلا رکھا ہے

اپنے زخموں کی دوا جا کے میں کس سے مانگوں
زہر کا نام بھی دُنیا نے دوا رکھا ہے

منحصر ہے اُسی شکوہ پہ رفاقت کا بھرم
ایک شکوہ جو ابھی میں نے اُٹھا رکھا ہے

اب جو مسجد ہے کبھی ایک صنم خانہ تھا
گھر پُرانا ہے مگر نام نیا رکھا ہے

○

مرا کلام اُسے کچھ بُرا لگے گا ضرور
مری کتاب زمانہ مگر پڑھے گا ضرور

سزا کے خوف سے تم چاہے چُپ رہو لیکن
جو بات سچ ہے کوئی دل جلا کہے گا ضرور

جو اہلِ ظرف ہیں شاید زباں سے کچھ نہ کہیں
جو دل پہ چوٹ لگے گی تو دل دُکھے گا ضرور

خود اپنے گھر میں ہو کوئی کہ صحنِ گلشن میں
جو حبس ہو گا فضا میں تو دم گھُٹے گا ضرور

ہَوا چلے نہ چلے، یہ عمل مقدّر ہے
چراغ جو بھی جلے گا کبھی بجھے گا ضرور

مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے
چراغ جب بھی بجھے گا دُھواں اُٹھے گا ضرور

بُجھے چراغ حفاظت سے طاق میں رکھ دو
کہ اپنے وقتِ معیّن پہ دن ڈھلے گا ضرور

ہمارے شہر کی روداد چھُپ نہیں سکتی
یہ حال کوئی مؤرخ کہیں لکھے گا ضرور

جو بات حق ہے کہے جاؤ مستقل اقبالؔ
تمہاری بات کبھی تو کوئی سُنے گا ضرور

○

آشنا ہوتے ہوئے بھی آشنا کوئی نہیں
جانتے سب ہیں مجھے پہچانتا کوئی نہیں

ایک تنہا میرے ذمّے کیوں ہے کارِ احتجاج
بولنا سب جانتے ہیں، بولتا کوئی نہیں

مے کشی کی بھی سزا ہے، خودکشی کی بھی سزا
کون کس مشکل میں ہے، یہ دیکھتا کوئی نہیں

مختصر لفظوں میں یہ ہے اب مزاجِ دوستی
رابطہ سب سے ہے، لیکن واسطہ کوئی نہیں

ہم نے خود پیدا کئے ہیں زندگی میں مسئلے
ورنہ سچّی بات یہ ہے مسئلہ کوئی نہیں

خود کلامی تھی جسے میں گفتگو سمجھا کیا
میں اکیلا تھا، یہاں آیا گیا کوئی نہیں

حُسن ہو نا مہرباں یا عشق خود بے مہر ہو
ہار دونوں کی ہے اس میں جیتتا کوئی نہیں

ایک پتھر آج میری آنکھ پر آکر لگا
میں غلط سمجھا، مجھے پہچانتا کوئی نہیں

محفل بُجھی بُجھی سی ہے، بے رونقی تو ہے
گنتی کے کچھ چراغ سہی، روشنی تو ہے

اپنی زباں سے غیر کو بھی کیوں بُرا کہو
دُشمن سہی، تعلّقِ ہمسائیگی تو ہے

آوارہ گردِ شہر کو پتّھر نہ مارنا
آدابِ آشنا نہ سہی، آدمی تو ہے

بھر جائے گا یہ زخم بھی، کیوں فکرمند ہو
گہرا تو ہے ضرور مگر زخم ہی تو ہے

مشکل کُشا مُصر ہے کہ ہم التجا کریں
اور التجا گدائی ہے، مشکل یہی تو ہے

خدشہ فقط نوشتۂ تقدیر سے نہیں
اندیشۂ نوشتۂ دیوار بھی تو ہے

بیٹھے تو ہیں سکون سے اپنے گھروں میں لوگ
تاریک و تنگ ہی سہی اپنی گلی تو ہے

اقبالؔ پھر سُنا ہے کہ آنے کو ہے بہار
یہ بات ہم نے پہلے بھی اکثر سُنی تو ہے

○

مختصر ہو کس طرح یہ نفسیاتی فاصلہ
اک طرف پندارِ ثروت، اک طرف مفلس اَنا

آپ نے جو کچھ کہا، فرمائیے کس نے سُنا؟
ایسی محفل میں بیانِ حالِ دل سے فائدہ؟

کوئی قصداً غرق ہو جائے تو اس کا کیا علاج
اس کو سب الزام دیں گے، کیا خدا، کیا ناخدا

دیکھنے کی بات یہ ہے دینے والا کون ہے
ورنہ جو کشکولِ سائل ہے، وہی دستِ دعا

زندگی پہ اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں
ٹھیک دریا کے کنارے ہے زمینِ کربلا

اور تیزی سے کنارے آ لگی کشتی مری
موجِ طوفاں بھی کبھی کرتی ہے کارِ ناخدا

کل کہیں تھے، اب کہیں ہیں اور سفر میں ہیں ہنوز
ہم مُسافر کیا بتا دیں مُستقل اپنا پتہ

عشق ہوتا ہے مزاجاً انتہائی زود رنج
ہر ذرا سی بات بن جاتی ہے نازک مسئلہ

منصب تو ہمیں بھی مل سکتے تھے لیکن یہ شرطِ حضوری تھی
یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی بس اتنی سی مجبوری تھی

کہتے ہیں کہیں اک نگری تھی سلطانِ جہاں کا جابر تھا
اور جبر کا اذنِ عام بھی تھا یہ رسم وہاں جمہوری تھی

کچھ درد سا ہے تو پہلو میں پہلے سے لیکن ہلکا ہے
یا دستِ جفا کچھ نازک تھا یا شاید ضرب ادھوری تھی

نظریں بھی ملیں، کچھ لب بھی ہلے ماتھے پہ شکن بھی اک اُبھری
گو مُنہ سے اس نے بات نہیں کی بات تو لیکن پوری تھی

یہ بات ہے برسوں پہلے کی جب ہم بھی عینی شاہد تھے
اک دورِ بہاراں آیا تھا لیکن وہ بہار عبوری تھی

ہم ٹھوکر کھا کر جب بھی گرے، رہ گیروں کو آواز نہ دی
وہ آنکھوں کی معذوری تھی، یہ غیرت کی مجبوری تھی

لہجے میں انا، ماتھے پہ شکن، اس وقت کا عین تقاضا ہے
اب ہر وہ بات ضروری ہے جو پہلے غیر ضروری تھی

ہم اہلِ سخن کی قیمت ہے اقبالؔ زبانی داد و دہش
کل محفل میں جو ہم کو ملی، وہ داد نہ تھی، مزدوری تھی

○

فکریں فقط تمہیں کو نہیں ہیں ہمیں بھی ہیں
ہنس بول تو رہے ہیں، پریشاں تو نہیں

گھر کے چراغ بجھ گئے، گھر تو نہیں گرا
جھونکا ہوا کا ہے کوئی طوفان تو نہیں

سالم ہے اب بھی میرے گریباں کا تار تار
یہ قیس و کوہکن کا گریبان تو نہیں

وہ خوش نصیب تھے جو سلامت گزر گئے
راہِ وفا مگر کوئی آسان تو نہیں

جاری ہے اب بھی سلسلۂ پرسش و سلام
پہلے سے ربط و ضبط کا امکان تو نہیں

اب نقدِ جاں بھی پیش کریں گے حضورِ دوست
ہم اب بھی ایسے بے سر و ساماں تو نہیں

اِک دوست نے بُلایا ہے ہم کیسے ٹال دیں
یہ کوئی قصرِ شاہی کا فرمان تو نہیں

اقبالؔ پھر بھی ساتھ تو دینا ہے وقت کا
مانا کہ دِل میں اب کوئی ارمان تو نہیں

○

دل کی بربادی میں شامل تھی رضا آنکھوں کی
اس کی پاداش میں کام آئی ضیاء آنکھوں کی

آنکھ ماحول سے جب ترکِ تعلق کر لے
غور کیجے تو وہ ہوتی ہے انا آنکھوں کی

زیرِ لب موجِ تبسم نہ غمِ وسا نہ لباس
حسنِ معصوم کی پہچان حیا آنکھوں کی

حالِ دل لفظوں کا محتاج ہے یہ کس نے کہا
کوئی سمجھے تو یہ آنسو ہیں صدا آنکھوں کی

ہم کو لے ڈوبے گا یہ ظاہر و باطن کا تضاد
روح کا کرب جدا، راہ جدا آنکھوں کی

گوہرِ اشک کو ارزاں نہیں کرتے یہ لوگ
قدر پہچانتے ہیں اہلِ وفا آنکھوں کی

آنکھ والوں نے اُڑایا ہے اندھیروں کا مذاق
روشنی چھین نہ لے اُن سے خدا آنکھوں کی

خوش نگاہی کی تو کچھ اور سزا ہوتی ہے
بے نگاہی تو بہت کم ہے سزا آنکھوں کی

اس کو کیا کہتے ہیں اقبالؔ میں کس سے پوچھوں
حُسنِ خود داد طلب اور خطا آنکھوں کی

○

یہ خلوص کوئی خلوص ہے کہ دلوں میں ربطِ بہم نہیں
تمہیں اعترافِ ستم نہیں، مجھے اعتبارِ کرم نہیں

یہ سنا تھا عشق کو آنسوؤں سے بہت قریب کا ربط ہے
تو یہ میرے عشق کو کیا ہوا، ابھی میری آنکھ تو نم نہیں

مجھے زہرِ عشق قبول ہے جو مری وفا کا زیاں نہ ہو
مجھے اپنی آن عزیز ہے، مری جان اتنی اہم نہیں

وہ خوشی بھی کوئی خوشی ہوئی جو رہینِ دستِ سوال ہو
یہ تو زندگی کا مزاج ہے، مجھے غم کا کوئی بھی غم نہیں

یہ فقط غرور کی بات ہے کہ زباں سے اپنی نہ تم کہو
تمہیں ورنہ اس کی خلش تو ہے کہ تمہاری بزم میں ہم نہیں

جو سلوک ازرہِ رسم ہو وہ تمام عمر بھی ہو تو کیا
جو خلوصِ قلب کے ساتھ ہو تو وہ اک نگاہ بھی کم نہیں

مری آنکھ بجھ بھی گئی تو کیا، مری روشنی مرے ساتھ ہے
ابھی میرا چاند چھپا نہیں، مرے گھر میں شامِ الم نہیں

مری بات ہوتی ہے دو بدو میں خطاب کرتا ہوں روبرو
مرے سامعین کی خیر ہو، مجھے احتیاجِ قلم نہیں

یہ جو شکوے تم کو وطن سے ہیں وہ بجا سہی مرے دوستو!
مگر ایک بات نہ بھولنا، یہ تمہارا گھر ہے، ارم نہیں

○

اپنے ماضی سے جو ورثے میں ملے ہیں ہم کو
ان اصولوں کی تجارت نہیں ہو گی ہم سے

عہدِ حاضر کی ہر اِک بات ہمیں دِل سے قبول
صرف توہینِ روایت نہیں ہو گی ہم سے

جھوٹ بھی بولیں، صداقت کے پیمبر بھی بنیں
ہم کو بخشو، یہ سیاست نہیں ہو گی ہم سے

زخم بھی کھائیں، رقیبوں کو دُعائیں بھی دیں
اتنی مخدوش شرافت نہیں ہو گی ہم سے

سُرخ پتھر کے صنم ہوں کہ وہ مرمر کے صنم
بُتکدوں میں تو عبادت نہیں ہو گی ہم سے

ہے اطاعت کے لئے اپنا فقط ایک خدا
ناخداؤں کی اطاعت نہیں ہوگی ہم سے

غیر مشروط رفاقت کے طرف دار ہیں ہم
شرط کے ساتھ رفاقت نہیں ہوگی ہم سے

فکر و اظہار میں ہم حکم کے پابند نہیں
شاعری حسبِ ہدایت نہیں ہوگی ہم سے

صرف یہ باتیں اگر آپ گوارا کرلیں
آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی ہم سے

○

وہ خوش فہمی جو منزل آشنا ہونے سے پہلے تھی
ہمیں بھی تھی مگر کچھ تجربہ ہونے سے پہلے تھی

وہ اب ہوتی تو کتنی کام آتی سارے گلشن کے
جو بے تابی اسیروں میں رہا ہونے سے پہلے تھی

کئی وعدے کئے تھے اُس نے مجھ سے صدقِ نیّت سے
یہ ساری گفتگو لیکن جُدا ہونے سے پہلے تھی

نگاہِ حُسن میں بھی قدر تھی میری محبّت کی
مگر یہ قدر عرضِ مُدعا ہونے سے پہلے تھی

تلافی کر گئی اُس کے سلوکِ بے نیازی کی
وہ اِک موجِ تبسّم جو خفا ہونے سے پہلے تھی

اُسی کا نام ہے شاید متاعِ آرزومندی
جو لذّت زخمِ دل کے لادوا ہونے سے پہلے تھی

ہمیں عادت نہ اب ہے اور نہ تھی فریاد کرنے کی
کبھی تھی بھی تو احساسِ اَنا ہونے سے پہلے تھی

کبھی حق گوئی پر بھی مصلحت کوشی کا پہرہ تھا
مگر یہ رسم میرے لب کُشا ہونے سے پہلے تھی

کوئی وعدہ کرے گا اور قصداً بھول جائے گا
ہمیں اس کی خبر عہدِ وفا ہونے سے پہلے تھی

مصائب جھیل کر اقبالؔ ہم کو ہوش آیا ہے
مگر اس کی ضرورت حادثہ ہونے سے پہلے تھی

○

حیرت ہے کہ طوفان سے ہم کیسے گزر آئے
شاید ابھی دُنیا کو ضرورت ہے ہماری

ناموسِ روایت بھی، سیادت بھی، اَنا بھی
صد شکر کہ ہر چیز سلامت ہے ہماری

دُشمن بھی جو سچ پُوچھو تو محسن ہیں ہمارے
اِن سب کی بدولت ہی تو عزّت ہے ہماری

پُرسشِ سرِ بازار، شکایت سرِ محفل
اب آپ کے نزدیک یہ قیمت ہے ہماری

ہر آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے ہمارا
دُکھ جیا ہے کسی کا ہو امانت ہے ہماری

ہم لوگ تو دشمن سے بھی کینہ نہیں رکھتے
جب چاہو چلے آؤ، اجازت ہے ہماری

بولیں تو خطا وار، نہ بولیں تو خطا وار
ہر حال میں اقبال مصیبت ہے ہماری

○

اب تو مفہوم ہی کچھ اور ہے سچائی کا
مصلحت طور بدل دیتی ہے گویائی کا

دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں ہے جن کو
ان غریبوں پہ بھی الزام ہے بینائی کا

آپ کے سامنے بیمار نے دم توڑا ہے
اب کبھی نام نہ لیجیے گا مسیحائی کا

میں نے یہ سوچ کے شہرت کا تعاقب نہ کیا
اس میں کچھ اور بھی اندیشہ ہے رسوائی کا

کنج تنہائی تو کچھ ایسی بری چیز نہیں
ہے بری چیز تو احساس ہے تنہائی کا

میرا دل رکھنے کی خاطر ہے اگر یہ وعدہ
شکریہ آپ کی اس حوصلہ افزائی کا

اتنے گہرے ہیں ابھی زخم شناسائی کے
نام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں شناسائی کا

اور کب تک یونہی ارزانیٔ ناموس و ضمیر
فائدہ کیا ہوا اب تک کی جبیں سائی کا

جب اُن سے ملے تب صبر آیا، جو خود بھی لُٹ کر آئے تھے
پہلے پہل اس شہر میں ورنہ ہم تو بہت گھبرائے تھے

احباب، مریضِ غم کے لئے کچھ چارہ گروں کو لائے تھے
پھر کیا جانے کیوں لوٹ گئے، دروازے تک تو آئے تھے

جب گھر کی آگ بجھی تو کچھ سامان بچا تھا جلنے سے
سو وہ بھی اُن کے ہاتھ لگا جو آگ بجھانے آئے تھے

جو لوگ شریکِ سازش تھے ہم نام بھی اُن کا کیسے لیں
کچھ اُن میں دوست پُرانے تھے کچھ باعزّت ہمسائے تھے

کچھ اہلِ خرد اب کہتے ہیں، اس حال سے ماضی اچھا تھا
اور یہی جب ہم نے کہا تھا، دیوانے کہلائے تھے

بے چارے چارہ سازوں کو، ناکامی کا الزام نہ دو
وہ ان زخموں کا کیا کرتے جو جان کے ہم نے کھائے تھے

اس شوقِ غزل گوئی سے، اُن کی حُرمت بھی مجروح ہوئی
جو زخم بڑی مشکل سے ہم نے ساری عمر چُھپائے تھے

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں، اک نازک سی دشواری ہے
آغازِ وفا خود ہم نے کیا تھا، پہلی بھول ہماری ہے

دُکھ تم کو جب جب پہنچا ہے، خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دِل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے، اب کے تمھاری باری ہے

بے کھیلے بازی جیت کے بھی تم ہم سے شاکی رہتے ہو
اور ہم کو دیکھو ہم نے تو خود جان کے بازی ہاری ہے

وہ عہد تھا عشق و جوانی کا، اب عمر ہے سعیِ تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

کچھ دردِ نہاں، کچھ فکرِ جہاں، کچھ شرمِ خطا، کچھ خوفِ سزا
اِک بوجھ اُٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

جو کاری زخم لگا ہے دِل پر پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا، یہ کِس کی کارگزاری ہے

جو صاحب گھر گھر میری بابت زہر اُگلتے پھرتے ہیں
وہ صرف مرے ہمسائے نہیں ہیں، اُن سے قرابت داری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں کچھ رہبر بھی، کچھ رہزن بھی
اب نقشِ قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمّہ داری ہے

اپنے مرکز سے اگر دُور نکل جاؤ گے
خواب ہو جاؤ گے، افسانوں میں ڈھل جاؤ گے

اب تو چہروں کے خد و خال بھی پہلے سے نہیں
کس کو معلوم تھا تم اتنے بدل جاؤ گے

اپنے پرچم کا کہیں رنگ بھلا مت دینا
سُرخ شعلوں سے جو کھیلو گے تو جل جاؤ گے

دے رہے ہیں تمہیں جو لوگ رفاقت کا فریب
ان کی تاریخ پڑھو گے تو دہل جاؤ گے

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

خواب گاہوں سے نکلتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو
دھوپ اتنی تو نہیں ہے کہ پگھل جاؤ گے

تیز قدموں سے چلو اور تصادم سے بچو
بھیڑ میں سست چلو گے تو کچل جاؤ گے

ہمسفر ڈھونڈو، نہ رہبر کا سہارا چاہو
ٹھوکریں کھاؤ گے تو خود ہی سنبھل جاؤ گے

تم ہو اک زندۂ جاوید روایت کے چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے

صبح صادق مجھے مطلوب ہے کس سے مانگوں
تم تو بھولے ہو چراغوں سے بہل جاؤ گے

○

نقشِ ماضی کے جو باقی ہیں مٹا مت دینا
یہ بزرگوں کی امانت ہے گنوا مت دینا

وہ جو رزاقِ حقیقی ہے اُسی سے مانگو
رزق برحق ہے کہیں اور صدا مت دینا

بھیک مانگو بھی تو بچّوں سے چُھپا کر مانگو
تم بھکاری ہو کہیں ان کو بتا مت دینا

صبحِ صادق میں بہت دیر نہیں ہے لیکن
ابھیَ عجلت میں چراغوں کو بجھا مت دینا

اپنے مشکوک اِرادوں کی زیاں کاری پر
اپنی تقدیر کو اِلزامِ خطا مت دینا

تم کو ورثے میں ملی ہے جو بڑوں کی سوغات
زنگ خانوں میں یہ شمشیر چھپا مت دینا

پیروی چاہتا ہے جادۂ قرآن و حدیث
ان صحیفوں کو فقط گھر میں سجا مت دینا

غیر مشروط رفاقت ہی کا سودا کرنا
شرط کے ساتھ رفاقت پہ رضا مت دینا

میں نے جو کچھ بھی کہا صرف محبّت میں کہا
مجھ کو اِس جرم محبّت کی سزا مت دینا

○

راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو ہٹا دینا ہے
لاکھ اُونچی سہی، دیوار گرا دینا ہے

ہم پہ اس عہد کا جو قرض چلا آتا ہے
اب کے جیسے بھی ہو وہ قرض چکا دینا ہے

اپنی غیرت پہ بہت ظلم کیے ہیں ہم نے
خود کو اب اپنے ہی ہاتھوں سے سزا دینا ہے

تاکہ پسپائی کا امکان ہی باقی نہ رہے
ایک بار اور سفینوں کو جلا دینا ہے

ہم ابھی چُپ ہیں مگر روزِ حساب آنے دو
ہم کو معلوم ہے کیا لینا ہے، کیا دینا ہے

بادِ صرصر سے کوئی اور توقع بے سود
اس کی فطرت تو چراغوں کو بجھا دینا ہے

اب توقف کی ضرورت ہے، نہ خوش فہمی کی
فتنۂ جبر کو بر وقت دبا دینا ہے

ہم نے سیکھا ہے اذانِ سحری سے یہ اصول
لوگ خوابیدہ سہی، ہم کو صدا دینا ہے

ہم کو حالات نے مجبور کیا ہے ورنہ
ہم فقیروں کا تو معمول دُعا دینا ہے

جب آدمی کا طرزِ سخن معتبر نہ ہو
زیبِ سخن حوالۂ قرآں ہوا تو کیا

زنجیرِ پا تو اپنی جگہ برقرار ہے
زندانیوں پہ وا درِ زنداں ہُوا تو کیا

ظلمت کدے دِلوں کے منوّر نہ ہو سکے
بالاہتمام جشنِ چراغاں ہُوا تو کیا

غُنچے کِھلے کہیں نہ نسیمِ سحر چلی
صحنِ چمن میں شغلِ بہاراں ہُوا تو کیا

اہلِ جنوں بچا نہ سکے عصمتِ چمن
اس جستجو میں چاکِ گریباں ہُوا تو کیا

اعلانِ آفتابِ فروزاں ہُوا تو کیا
ایوانِ خاص صرفِ درخشاں ہُوا تو کیا

جو اس کے دِل میں حشر بپا ہے، نہ پوچھیے
اقبالؔ بے دِلی سے غزل خواں ہُوا تو کیا

○

اپنے لئے کچھ اور ہے عنوانِ تشفّی
یہ سعیٔ تبسّم تو زمانے کے لئے ہے

جو اصل حقیقت ہے، ہمیں بھی نہیں معلوم
احوال تو دُنیا کو سُنانے کے لئے ہے

ماحول کی افسردہ دلی غور طلب ہے
یہ رونقِ محفل تو دکھانے کے لئے ہے

کچھ اور ہیں دیرینہ رفاقت کے تقاضے
پُرسش تو فقط رسم نبھانے کے لئے ہے

○

زخمِ دل سارے زمانے کو دِکھانے سے رہے
آبرو ہم سرِ بازار لُٹانے سے رہے

غم ہمارا جو کسی نے نہیں سمجھا نہ سہی
آہ کرنے سے رہے، اشک بہانے سے رہے

تم نے پُرسش تو بڑے پیار سے کی ہے لیکن
حالِ دل ہم سرِ محفل تو سُنانے سے رہے

کیا کریں آپ سے ملنے کی یہی صورت ہے
ورنہ ہم محفلِ اغیار میں جانے سے رہے

شکوہ کرنا ہمیں آتا نہ ہو ایسا تو نہیں
اپنے یاروں کا مگر دِل تو دُکھانے سے رہے

وہ بُرا ہے کہ بھلا ہے وہی پیارا ہے ہمیں
اب کوئی اور نیا دوست بنانے سے رہے

گاہے گاہے کوئی رُوٹھے تو سر آنکھوں پہ مگر
روز رُوٹھے کوئی تو روز منانے سے رہے

○

وہ خزاں ہو یا بہاراں، دونوں مقسومِ چمن
اُن کا منصب مشترک ہے، مختلف ہیں پیرہن

عشق میں پندارِ سلطانی بھی کھا جاتا ہے مات
بندۂ زُلفِ ایاز اور ایک مردِ بُت شکن

آپ کو ساقی گری پر ناز ہے لیکن حضور
آپ کے نزدیک ہی بیٹھے ہیں کچھ تشنہ دہن

کتنے مقصد لے کے اُٹھتی ہے کسی کی ہر نظر
دِل شکن، پیماں شکن، توبہ شکن، ایماں شکن

ایسی صورت میں بیانِ حالِ دِل کا کیا سوال
وہ مزاجاً بے مروّت، ہم اصولاً کم سخن

اس کو کہتے ہیں نیاز و ناز میں اک ربطِ خاص
میرے ماتھے پر پسینہ، اُن کے ماتھے پر شکن

ہم نے اوروں سے سُنا ہے کیا خبر سچ ہے کہ جھوٹ
غمگساری اِک اداکاری ہے، پُرسش ایک فن

نکتہ چینوں کی مسلسل سازشوں کے باوجود
ہے غزل اقبالؔ اب بھی معتبر صنفِ سخن

○

قائل تو میں بھی حفظِ مراتب کا ہوں مگر
میں نے کبھی کسی کا قصیدہ نہیں کہا

واقف ہوں میں غزل کی روایات سے مگر
قاتل کو میں نے رشکِ مسیحا نہیں کہا

اہلِ حرم کا حال بھی معلوم ہے مجھے
میں نے اُنھیں بھی قبلہ و کعبہ نہیں کہا

حتیٰ کہ شیخِ وقت کو دعووں کے باوجود
مشکل کشائے ملّتِ بیضا نہیں کہا

معیارِ حسن بھی مرا کچھ منفرد سا ہے
مَیں نے کسی کو غیرتِ زہرہ نہیں کہا

زُلفوں کو دام، آنکھوں کو جادو، لبوں کو پھول
اور آدمی کو چاند کا ٹکڑا نہیں کہا

میں قدر داں ہوں حُرمتِ حسن و جمال کا
میں نے کسی کو جانِ تمنا نہیں کہا

کوئے بتاں سے ربط رہا بھی اگر کبھی
کوئے بتاں کو شہرِ زلیخا نہیں کہا

اپنے معاملے میں بھی میں حق پسند ہوں
نابینا آنکھ کو بھی بینا نہیں کہا

نابینا آنکھ کو مگر اتنا شعور ہے
تاریکیوں کو میں نے اُجالا نہیں کہا

اس کا ثبوت یہ ہے کہ موصوف کو کبھی
اپنی زباں سے میں نے فرشتہ نہیں کہا

○

خلاف ورزیٔ احکامِ مصطفیٰؐ نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو

خود اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی مانگو
پرائے گھر کے چراغوں کا آسرا نہ کرو

تمہارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گداگروں کی طرح عرضِ مدعا نہ کرو

صفیں درست کرو اور قدم ملا کے بڑھو
یہ وقت اور ہے اب صرف التجا نہ کرو

دُعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈو فقط دُعا نہ کرو

جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو
گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

قصور کس کا ہے اپنے ضمیر سے پوچھو
خدا کے واسطے تقدیر کا گلہ نہ کرو

یہ گھر تمہارا ہے، گھر کے مکیں تمہارے ہیں
جو اپنے لوگ ہیں ان کو جدا جدا نہ کرو

خود اپنے اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھو
ہر ایک بات پہ تنقیدِ رہنما نہ کرو

وطن کا حق بھی ہے تم پر اگر یہ یاد رہے
تو کون کہتا ہے تم سے مشاعرہ نہ کرو

○

خلوص لے کے بڑھو، اعتبار لے کے بڑھو
یقینِ رحمتِ پروردگار لے کے بڑھو

گلو میں طوقِ عقیدت، جلو میں عزمِ ظفر
دلوں میں حوصلۂ سازگار لے کے بڑھو

چلو تو چال میں پامردیٔ عمرؓ لے کر
بڑھو تو دبدبۂ ذوالفقار لے کے بڑھو

تمھیں ضمیرِ شہیدانِ کربلا کی قسم
سرِ نیاز بصد افتخار لے کے بڑھو

نگاہِ طارق و خالد کا واسطہ تم کو
جدھر بڑھو نگہۂ اعتبار لے کے بڑھو

جبیں پہ روشنیٔ طاقِ خانۂ کعبہ
نظر میں شعلۂ مومن شعار لے کے بڑھو

بنامِ پرچمِ توحید و نعرۂ تکبیر
نظامِ مصطفویؐ کا وقار لے کے بڑھو

یقینِ محکم و تنظیم و اتحاد کے ساتھ
نشانِ سبز بصد افتخار لے کے بڑھو

○

وہ موجِ تبسم شگفتہ شگفتہ، وہ بھولا سا چہرہ کتابی کتابی
وہ سُنبل سے گیسو سُنہرے سُنہرے، وہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی

کفِ دستِ نازک حنائی حنائی، وہ لبہائے شیریں شہابی شہابی
وہ باتوں میں جادو، اداؤں میں ٹونا، وہ دُزدیدہ نظریں عقابی عقابی

کبھی خوش مزاجی، کبھی بے نیازی، ابھی ہوشیاری، ابھی نیم خوابی
قدم بہکے بہکے، نظر کھوئی کھوئی، وہ مخمور لہجہ شرابی شرابی

نہ حرفِ تکلّم، نہ سعیِ تخاطب، سرِ بزم لیکن بہم ہم کلامی
اِدھر چند آنسو سوالی سوالی، اُدھر کچھ تبسّم جوابی جوابی

وہ سیلابِ خوشبو گلستاں گلستاں، وہ سروِ خراماں بہاراں بہاراں
فروزاں فروزاں جبیں کہکشانی، درخشاں درخشاں نظر ماہتابی

نہ ہونٹوں پہ سُرخی نہ آنکھوں میں کاجل، نہ ہاتھوں میں کنگن نہ پیروں میں پائل
مگر حسنِ سادہ مثالی مثالی، جوابِ شمائل فقط لاجوابی

وہ شہرِ نگاراں کی گلیوں کے پھیرے، سرِ کوئے خوباں فقیروں کے ڈیرے
مگر حرفِ پرسش، نہ اذنِ گزارش، کبھی نامرادی کبھی باریابی

یہ سب کچھ کبھی تھا مگر اب نہیں ہے، کہ آوارہ فرہاد گوشہ نشیں ہے
نہ تیشہ بدوشی، نہ خارہ شگافی نہ آہیں نہ آنسو، نہ خانہ خرابی

کہ نظروں میں اب کوئی شیریں نہیں ہے جدھر دیکھئے اک مریم کھڑی ہے
نجابت سراپا، شرافت مجسّم، یہ عصمت مزاجی، یہ عفّت مآبی

جو گیسو سنہرے تھے اب نقرئی ہیں، جن آنکھوں میں جادو تھا اب باوضو ہیں
یہ پاکیزہ چہرے یہ معصوم آنکھیں، نہ وہ بے حجابی نہ وہ بے نقابی

وہ عشقِ مجازی حقیقت میں ڈھل کر تقدّس کی راہوں پہ اب گامزن ہے
جو حسنِ نگاراں فریبِ نظر تھا، فرشتوں کی صورت ہے گردوں جنابی

وہ صورت پرستی سے اُکتا گیا ہے، خلوصِ نظر اور کچھ ڈھونڈتا ہے
نہ موجِ تبسّم نہ دستِ حنائی نہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی

نہ دزدیدہ نظریں عقابی عقابی، نہ مخمور لہجہ شرابی شرابی
نہ سُنبل سے گیسو سُنہرے سُنہرے نہ لب ہائے شیریں گلابی گلابی

بزرگوں سے بچپن میں ہم نے سُنا تھا کہ ماضی میں دستورِ مہر و وفا تھا
تو پھر قیس و فرہاد کس دور میں تھے، وہ تیمور و چنگیز کا عہد کیا تھا

وہ رُوداد شدّاد و حجّاج کیا ہے، وہ سقراط کو زہر کس نے دیا تھا
میں بے درد دُنیا سے یہ پوچھتا ہوں، مسیحا سے کیا جُرم سرزد ہوا تھا

وہ طائف میں کیوں سنگ باری ہوئی تھی، سرِ کربلا خون کس کا بہا تھا
یہ سب کچھ تسلسل سے کیوں پیش آیا، وہ ماضی نہیں تھا تو پھر اور کیا تھا

یہ جبر و تشدّد تو اِک سلسلہ ہے، نہ یہ اب نیا ہے نہ پہلے نیا تھا
ہمیں عہدِ حاضر سے شکوہ ہے لیکن، جو اب ہو رہا ہے ہمیشہ ہُوا تھا

ہمیں یاد ہے گھر سے ہم جب چلے تھے تو منزل کو جنّت بتایا گیا تھا
مگر کہنے والوں نے جو کچھ کہا تھا وہ شاید کہیں اور کا تذکرہ تھا

جہاں کچھ ثقہ لوگ داخل ہوئے تھے وہاں باوضو ہم بھی پہنچے تھے لیکن
جو دیکھا تو کچھ اور ہی ماجرا تھا، وہ مسجد نہیں تھی کوئی بتکدہ تھا

جو تنقیدِ ناحق پہ وہ کچھ نہ بولا، تو اقبالؔ کو بے زباں تم نے جانا
جو سمجھو تو وہ بے زبانی نہیں تھی، وہ محفل پہ بھرپور اک تبصرہ تھا

ہم نگری نگری جاتے ہیں اور گھر گھر گیت سُناتے ہیں
ہم گلیوں گلیوں، آنگن آنگن پیار کے دیپ جلاتے ہیں

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں اور سودا سچّا کرتے ہیں
جو گاہک پھولوں جیسا ہو، ہم بِن داموں بِک جاتے ہیں

ہم شہرِ وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دِل کی چوٹ چھپاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

جو لوگ شرافت والے ہیں، وہ قدرے بُزدل ہوتے ہیں
دُشمن سے نہیں ڈرتے وہ مگر کم ظرفوں سے گھبراتے ہیں

احساسِ حمیّت اہلِ نسب کی سب سے بڑی کمزوری ہے
وہ اپنوں سے بھی حالِ پریشاں کہتے ہوئے شرماتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں یہ کیسے کہیں سچ سب کے بس کی بات نہیں
جو سچی باتیں کرتے تھے وہ پیغمبر کہلاتے ہیں

اقبالؔ تو ادنیٰ خادم ہے اربابِ علم و دانش کا
یہ آپ کا حسنِ سماعت ہے جو اس پہ کرم فرماتے ہیں

○

نظامِ مصطفےؐ کی بات تو کرتے ہو تم لیکن
طرب خانے کہاں جائیں گے، جم خانوں کا کیا ہو گا

اساسِ زندگی ٹھہرا اگر دستورِ قرآنی
تو پیمانے کہاں رکھو گے، مے خانوں کا کیا ہو گا؟

اذاں گونجے گی ہر گوشے سے جب لحنِ بلالی میں
تو یہ سوچو کہ پوشیدہ صنم خانوں کا کیا ہو گا؟

اگر طاقِ حرم سے روشنی اس سمت آ پہنچی
تو شمعِ ساقیٔ محفل کے پروانوں کا کیا ہو گا؟

اُتاری جائے گی نانِ جویں جب حلقِ نازک میں
تو ظہرانوں کا، عصرانوں کا، عہمانوں کا کیا ہو گا؟

بچھے گا بوریا جب خواب گاہِ اہلِ عشرت میں
تو ان آراستہ شاہی شبستانوں کا کیا ہو گا؟

نقابیں چھین لی جائیں گی جب مکروہ چہروں سے
مُلمّع کیا کرے گا، آئینہ خانوں کا کیا ہو گا؟

اگر پردہ نشیں ہو جائے لیلیٰ عصرِ حاضر کی
تو ان آوارۂ بازار دیوانوں کا کیا ہو گا؟

اگر اس بار بھی وعدے غلط نکلے اکابر کے
تو غم خوارانِ ملّت کے گریبانوں کا کیا ہو گا؟

قطعات

یہ آنسو ہمارا لہجہ ہیں اور آنکھیں باتیں کرتی ہیں
تم ہونٹ ہمارے سی سکتے ہو، دیدۂ نم کیا چھینو گے

تم اہلِ قلم کی فکر کرو، ہم اہلِ زباں سے مت اُلجھو
ہم لکھتے نہیں ہم کہتے ہیں، تم ہم سے قلم کیا چھینو گے

قفس سے چھوٹ کے پچھتائے بندگانِ قفس
چمن کے شوق میں نادان بال و پر سے گئے

تمہارا شہر تو آباد ہو گیا لیکن
تمہارے شہر کی خاطر ہم اپنے گھر سے گئے

آدمی اندر سے چاہے ٹوٹ جائے
کم سے کم لہجہ توانا چاہیئے

غم غلط کرنا کوئی مشکل نہیں
اتفاقاً مسکرانا چاہیئے

ضبط بھی جزوِ شجاعت ہے مگر
ایک حد تک ظلم سہنا چاہیئے

ہونٹ ہی لو گے تو دم گھٹ جائے گا
بات سچّی ہو تو کہنا چاہیئے

قاضیٔ شہر کے حضور نہ جاؤ
اور نہ پیر و فقیر سے پوچھو

مستحق تم سزا کے ہو کہ نہیں
اپنے اپنے ضمیر سے پوچھو

راضی بہ رضا ہوتے ہیں اربابِ قناعت
وہ اپنا بھرم دستِ طلب سے نہیں کھوتے

دامانِ توکّل کی یہ خوبی ہے کہ اس میں
پیوند تو ہو سکتے ہیں، دھبّے نہیں ہوتے

ہم پہ کیا گزری ہے ماضی میں یہی مت پوچھو
کچھ مناسب نہیں وہ حال مفصّل کہنا

خون جس شہر میں پندارِ تمنّا کا ہُوا
ہم کو اچھا نہیں لگتا اسے مقتل کہنا

مقسوم ہمارے گُلشن کا جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے
ہر موسم میں گو زینت کی تدبیر بدل دی جاتی ہے

مدّت سے چلا آتا ہے یہی دستور ہمارے زنداں کا
جب شور مچاتے ہیں قیدی زنجیر بدل دی جاتی ہے

۱۵۷

○

ہم کیا کریں، مجبور ہیں، حکمِ خدا کچھ اور ہے
ہم چاہتے کچھ اور تھے لیکن ہوا کچھ اور ہے

دُنیا بھی ہاتھوں سے گئی، عقبیٰ کا حق بھی رد ہوا
کرنا ہمیں کچھ اور تھا، ہم نے کیا کچھ اور ہے

شکوہ میرا منشا نہ تھا، شاید تمہیں دھوکا ہوا
مَیں نے کہا کچھ اور تھا تم نے سُنا کچھ اور ہے

کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے اب فیصلہ کیسے کریں
گھر گھر خبر کچھ اور تھی اور ماجرا کچھ اور ہے

اب یہ ہے دنیا کی فضا، ظاہر جُدا باطن جُدا
دل میں ہوس کچھ اور ہے لب پہ دُعا کچھ اور ہے

یہ روگ تو ایسا نہیں، جس کی دوا ممکن نہ ہو
لیکن مرے تیمار داروں کی دُعا کچھ اور ہے

ہے زندگی منظور تو ذہنوں میں وسعت چاہیئے
کل تک فضا کچھ اور تھی اور اب فضا کچھ اور ہے

سب مجرموں سے مختلف، مجھ پہ نوازش کس لئے
سب کی سزا کچھ اور ہے، میری سزا کچھ ہے

○

جام آئے سبو آئے طاؤس و رباب آئے
محفل میں حضور آئے محفل میں جناب آئے

لیکن جو نگاہوں کا معیارِ توجہ تھے
وہ آئے بھی محفل میں تو زیرِ نقاب آئے

لو ہم تو چلے یارو تم سب کا خدا حافظ
اب چاہے شراب آئے اب چاہے کباب آئے

ہم بزمِ تمنا سے اُٹھ آئے تہی داماں
اب چاہے عذاب آئے اور چاہے ثواب آئے

اجڑی ہے نہ اجڑے گی محفل کبھی رندوں کی
کچھ خانہ خراب اُٹھے کچھ خانہ خراب آئے

سرکار ہی فرماویں کیا کیا ہے خطا میری
مجھ کو تو شمار آئے ان کا نہ حساب آئے

حق گوئی تو ہوتی ہے خوصاف ضمیروں کی
آتا ہے اگر ہم پر دنیا کا عتاب آئے

میں نے کچھ اور کہا آپ سے اور آپ نے کچھ اور سنا
مجھ میں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے شاید

جب بھی ملیے وہی تلخی وہی شکوے وہی ماتھے پہ شکن
آپ سے کوئی ملے آپ کا منشا ہی نہیں ہے شاید

میں نے تو پرسشِ احوال بھی کی اور مخاطب بھی ہوا
حسنِ اخلاق مگر آپ کا شیوہ ہی نہیں ہے شاید

بات اب منزلِ تشہیر تک آپہنچی ہے جستہ جستہ
اب بجز ترکِ تعلق کوئی رستہ ہی نہیں ہے شاید

آپ کچھ بھی کہیں ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے
آپ کو میری صداقت پہ بھروسہ ہی نہیں ہے شاید

اب وہ احباب نہ ماحول نہ آداب نہ پرسش نہ سلام
اب تو محفل میں کوئی اپنا شناسا ہی نہیں ہے شاید

حاکمِ شہر پہ تنقید کا اقبال نتیجہ معلوم
اور وہ یہ کہ تمھیں شہر میں رہنا ہی نہیں ہے شاید

○

مجھ سے ملنے میں اگر رسوائی کا ڈر ہے تمھیں
میرے گھر کیوں آتے ہو تم کو بُلاتا کون ہے

تم نہیں سُنتے اگر افسانۂ غم مت سنو
ہر کس و ناکس کو حالِ دل بتاتا کون ہے

اور اگر میری غزل بھی زہر لگتی ہے تمھیں
تم سے کہتا کون ہے، تم کو سناتا کون ہے

تم مرے ہمدرد ہو کس نے کہا تم خود کہو
بے سبب مجھ کو ستاتا اور جلاتا کون ہے

بے نیازی سے، جفا سے، ناز سے، انداز سے
میری جانِ ناتواں کو آزماتا کون ہے

میری نیندیں اڑ گئی ہیں اور تمہیں معلوم ہے
دیدہ و دانستہ یہ نیندیں اڑاتا کون ہے

تم بظاہر تو بڑے معصوم صورت ہو مگر
سچ بتاؤ یہ ہنر تم کو سکھاتا کون ہے

ہم نے پہلے بھی کیا ہے ان کا اکثر اعتبار
ایسے وعدے تو بہت ہوتے ہیں آتا کون ہے

روٹھ جانا تو تمہارا روز کا معمول ہے
روٹھ جاؤ شوق سے تم کو مناتا کون ہے

زخم کی فکر نہیں زخم تو بھر جاتا ہے
بات کا زہر مگر دل میں اُتر جاتا ہے

شعر کہیے تو تغزل بھی سیاست ٹھہرے
اور چپ رہیے تو پندارِ ہُنر جاتا ہے

سن کے آجاتی ہے کچھ لوگوں کے ماتھے پہ شکن
کچھ نہ کچھ میرا سخن کام تو کر جاتا ہے

آپ سچ بولیں بڑے شوق سے بولیں لیکن
یہ سمجھ لیجیے کہ اس شوق میں سر جاتا ہے

میں یہی سوچ کے ہر رنج سہے جاتا ہوں
وقت جیسا بھی ہو آخر کو گزر جاتا ہے

تم تو آرام سے بیٹھے ہو تمھیں کیا معلوم
شوقِ تعمیر میں کچھ لوگوں کا گھر جاتا ہے

راہِ منزل میں وہ ہوتا ہے نزاکت کا محل
اپنے سائے سے بھی جب آدمی ڈر جاتا ہے

○

غلط سمجھے مجھے اربابِ ثروت
سخنور ہوں میں سوداگر نہیں ہوں

قصیدے میں نہیں پڑھتا کسی کے
غزل گو ہوں، مَیں پیشہ ور نہیں ہوں

اَنا ہے مجھ میں لیکن عجز کے ساتھ
مَیں خوش گو ہوں مگر خودسر نہیں ہوں

کتابوں کا مَیں خوشہ چیں نہیں ہوں
معلّم ہوں مَیں دانش ور نہیں ہوں

مجھے سچّی محبّت ہے وطن سے
میں شاعر ہوں کوئی رہبر نہیں ہوں

میں دشمن کو گلے کیسے لگا لوں
بشر ہوں کوئی پیغمبر نہیں ہوں

مجھے کیا واسطہ رُخسار و لب سے
خدا کا شکر دیدہ ور نہیں ہوں

بُتانِ شہر سب مہ رخ ہیں بے شک
مگر مَیں پیروِ آذر نہیں ہوں

یہ لطفِ خاص ہے مجھ پہ خدا کا
مہاجر ہوں مگر بے گھر نہیں ہوں

(

مہکے ہوئے خلوص سے محروم کر گئے
خوشبو مزاجِ لوگ نہ جانے کدھر گئے

اک اک ورق فضاؤں میں تحلیل ہو گیا
ایسی ہوا چلی کہ صحیفے بکھر گئے

جیسے ذرا سی دیر میں سب کچھ بدل گیا
کچھ اجنبی سے لوگ ملے ہم جدھر گئے

کوئی کسی کو شہر میں پہچانتا نہیں
مانوس لوگ پاس سے ہو کر گزر گئے

ہے روشنی بھی آج کی کتنی نظر فریب
سنتے ہیں لوگ اپنے ہی سائے سے ڈر گئے

اب رسمِ دوستی بھی نبھانا محال ہے
وہ اس طرف سے گزرے نہ ہم بھی ادھر گئے

کیا جانے ان کو میری غزل کیوں بُری لگی
محفل میں چند لوگوں کے چہرے اُتر گئے

اب تک تو ہم نے ان سے کبھی کچھ نہیں کہا
سوچا ہے اب کہ بات کریں گے اگر گئے

اب کس کی گفتگو کو کوئی مستند کہے
جو اعتبارِ فن تھے وہ اہلِ ہنر گئے

○

تقریبِ تاج پوشی کی محفل سجی تو ہے
کل کی خبر خدا کو ہے رونق ابھی تو ہے

ممکن ہے کچھ خزاں سے گھٹن دور ہو سکے
گلشن میں مختلف سی ہوا اک چلی تو ہے

اس سے ہمارے گھر بھی ہوں روشن تو جانیے
اک شمع انجمن میں سنا ہے جلی تو ہے

اب تو کسی کو ہم سے شکایت نہیں رہی
از راہِ مصلحت ہی سہی دوستی تو ہے

اپنی زباں سے ہم تمھیں کیسے بُرا کہیں
رسماً سہی تعلقِ ہمسایگی تو ہے

دیکھو کہیں تمہارے قدم ڈگمگا نہ جائیں
منجانبِ خدا تمھیں عزت ملی تو ہے

اب اپنے ذہن و دل کا ذرا جائزہ بھی لو
دونوں حرم کی تم کو زیارت ہوئی تو ہے

اقبالؔ پھر سُنا ہے کہ آنے کو ہے بہار
یہ بات ہم نے پہلے بھی اکثر سُنی تو ہے

○

وہ نظر سے دُور تو ہیں مگر یہ عجیب صورتِ حال ہے
ہمہ وقت پیشِ نظر بھی ہیں، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

نہ وہ ہم سے کم، نہ ہم اُن سے کم، وہ اُدھر خفا ہم اِدھر خفا
نہ اُنھیں ہمارا خیال ہے نہ ہمیں دماغِ سوال ہے

یہی قربتیں یہی فاصلے تو خلوصِ عشق کی جان ہیں
کبھی گردِ رنج و ملال ہے، کبھی فکرِ پرسشِ حال ہے

یہ تمھاری تلخ نوائیاں کوئی اور سہہ کے دکھا تو دے
یہ جو مجھ میں تم میں نباہ ہے، مرے حوصلے کا کمال ہے

مجھے اس کا کوئی بھی غم نہیں کہ کسی نے مجھ سے وفا نہ کی
میں کسی کے کام نہ آسکا مجھے صرف اس کا ملال ہے

چند نمائندہ غزلیں

قافیے اور ردیفیں

○

خوشی کا نام نہ لینا، خوشی کا ٹھیک نہیں
سفر میں ساتھ کسی اجنبی کا ٹھیک نہیں

یہ آفتاب کی رونق بھی کتنی دیر کی ہے
قدم بڑھائے چلو، روشنی کا ٹھیک نہیں

سحر نہیں ہے، یہ شاید نظر کا دھوکا ہے
چراغ گُل نہ کرو، تیرگی کا ٹھیک نہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لُٹ جائے
ذرا سنبھل کے چلو، زندگی کا ٹھیک نہیں

خدا بچائے گلستاں کو باغبانوں سے
یہ گُل فروش ہیں، ان میں کسی کا ٹھیک نہیں

خود اپنے حال پہ ہنستے ہوں یہ بھی ممکن ہے
جو دل شکستہ ہیں اُن کی ہنسی کا ٹھیک نہیں

مزید عرضِ تمنّا سے فائدہ اقبالؔ ؟
جو وعدہ پہلے ہُوا تھا اسی کا ٹھیک نہیں

○

ہم پیاسوں کے میخانے میں یوں جام چلے ہے
آنکھوں سے چھلک جائے ہے جب شام ڈھلے ہے

کیا پوچھو ہو ہم خانہ خرابوں کی کہانی
مٹی کا دِیا رُخ پہ ہواؤں کے جلے ہے

تھک جائیں تو سو جائیں کسی پیڑ کے نیچے
ہم خانہ بدوشوں کا یونہی کام چلے ہے

ڈیوڑھی سے تری آج میں کچھ لے کے ٹلوں گا
ٹلتی ہی چلی جائے ہے، جب بات ٹلے ہے

ہم باتیں بھی کر لے ہیں سرِ بزم کسی سے
آنکھوں سے محبّت میں بڑا کام چلے ہے

چمکے تو ہے سورج کی طرح حُسن تمہارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے

اے سروِ سرافراز ذرا دیکھ کے چلیو
اک شہرِ خموشاں ترے قدموں تلے ہے

دیوانے کے ہاتھوں میں یہ مٹّی ہے کہاں کی
چومے ہے کبھی اور کبھی آنکھوں سے ملے ہے

جو جاوے ہے کوچے میں ترے آوے ہے گھائل
تلوار کھنچے ہے نہ کوئی تیر چلے ہے

دیوانے کی یہ بات، بڑی بات ہے پیارے
سب پوچھیں ہیں لیکن وہ ترا نام نہ لے ہے

ماحول کا شکوہ کبھی اقبال نہ کیجو
وہ پھول بھی مہکے ہے جو کانٹوں میں پلے ہے

شکستِ ظرف کو پندارِ رندانہ نہیں کہتے
جو مانگے سے ملے ہم اُس کو پیمانہ نہیں کہتے

جہاں ساقی کے پائے ناز پر سجدہ ضروری ہو
وہ بُت خانہ ہے، اُس کو رند میخانہ نہیں کہتے

جنوں کی شرطِ اوّل ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اُس کو دیوانہ نہیں کہتے

جو ہو جائے کسی کا مستقل، بے شرکتِ غیرے
وہ دل کعبہ ہے، اُس دل کو صنم خانہ نہیں کہتے

نہایت شکریہ اِس پرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں، ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے

جہاں ہر وقت اِک محفل سجی ہو تیری یادوں کی
اُسے عشرت کدہ کہتے ہیں غم خانہ نہیں کہتے

غرض کچھ بھی ہو ہم کو یاد تو رکھنا ہے ہر لحظہ
عدو کو اپنے ہم اقبالؔ! بیگانہ نہیں کہتے

○

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

پرسشِ حال کی فرصت تمہیں ممکن ہے نہ ہو
پرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں

عرضِ احوال کی عادت بھی نہیں ہے ہم کو
اور حالات کا شاید یہ تقاضا بھی نہیں

بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا
میرے پندار کو اب شوقِ تماشا بھی نہیں

ہاتھ پھیلاؤں میں عیسیٰ نفسوں کے آگے
درد پہلو میں مرے ہے مگر اتنا بھی نہیں

اک شکن ماتھے پہ دیکھی تھی تمھارے ہم نے
پھر کبھی آنکھ اُٹھا کے تمھیں دیکھا بھی نہیں

آخری بار ہنسی آئی تھی کب، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اس کی تمنا بھی نہیں

میرے حالات نہ بدلے تو نہ بدلیں اقبالؔ
مجھ کو حالات پہ کچھ ایسا بھروسہ بھی نہیں

○

اک خطا ہم ازرہِ سادہ دِلی کرتے رہے
ہر تبسّم پر قیاسِ دوستی کرتے رہے

ایسے لوگوں سے بھی ہم ملتے رہے دل کھول کر
جو وفا کے نام پر سوداگری کرتے رہے

خود اندھیروں میں بسر کرتے رہے ہم زندگی
دوسروں کے گھر میں لیکن روشنی کرتے رہے

سجدہ ریزی پائے ساقی پر کبھی ہم نے نہ کی
اپنے اشکوں سے علاجِ تشنگی کرتے رہے

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کئے
زندہ رہنے کے لئے ہم خودکشی کرتے رہے

ہر طرف جلتے رہے بجھتے رہے جھوٹے چراغ
اور ہم سامانِ جشنِ تیرگی کرتے رہے

حالِ دل کہہ دیں کسی سے بارہا سوچا مگر
اس ارادے کو ہمیشہ ملتوی کرتے رہے

خود کو دیتے بھی رہے ترکِ تعلّق کا فریب
اور در پردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے

اس طرح اقبالؔ گزری ہے ہماری زندگی
زہرِ غم پیتے رہے اور شاعری کرتے رہے

( )

نقاب پوشوں کو للہ رہنما نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو

تمھارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گداگروں کی طرح عرضِ مدّعا نہ کرو

قصور کس کا ہے اپنے ضمیر سے پوچھو
خدا کے واسطے تقدیر کا گلہ نہ کرو

دُعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈو فقط دُعا نہ کرو

صفیں درست کرو اور قدم ملا کے بڑھو
یہ وقت اور ہے اب صرف التجا نہ کرو

جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو
گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

ہر ایک بات کا اک وقت ہے سخن سازو
مجاہدوں کی گھڑی میں مشاعرہ نہ کرو

بظاہر بے رخی ہے اور کرم پوشیدہ پوشیدہ
تخاطب اب بھی ہوتا ہے مگر دزدیدہ دزدیدہ

وہ کیا آئے مری خلوت میں میخانہ چلا آیا
نظر خوابیدہ خوابیدہ قدم لغزیدہ لغزیدہ

شکستِ حُسن کے منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
رُخِ افسردہ افسردہ ، لبِ لرزیدہ لرزیدہ

کوئی یوں سُن رہا تھا رات مجھ سے میرا افسانہ
کبھی شرمندہ شرمندہ ، کبھی نم دیدہ نم دیدہ

تعلق اُن سے باقی ہے فقط صاحب سلامت تک
ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں مگر سنجیدہ سنجیدہ

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

وہی اقبالؔ ، جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
نظر آتا ہے محفل میں بھی کچھ رنجیدہ رنجیدہ

○

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ ملا بھی ہے
اِس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دوسرا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اُس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

غرقاب کر دیا تھا ہمیں ناخدا نے آج
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

ساقی خفا ہے مجھ سے یہ معلوم ہے مجھے
لیکن وہ میرے ظرف کو پہچانتا بھی ہے

اے قافلے کے لوگو ذرا جاگتے رہو
سُنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

ہو تو رہی ہے کوششِ آرائشِ چمن
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

یہ حُسنِ اتفاق ہے یا حُسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فُرات وہیں کربلا بھی ہے

اقبالؔ شکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے

○

مَیں شگفتہ لبِ اظہار کہاں سے لاؤں
عشق و رومان کے اذکار کہاں سے لاؤں

قصۂ تلخیٔ دوراں میں سُنا سکتا ہوں
داستانِ لب و رُخسار کہاں سے لاؤں

اپنے احساس سے میں جھوٹ کہاں تک بولوں
شعر میں شوخیٔ افکار کہاں سے لاؤں

میں غزل گو ہوں قصیدہ تو نہیں کہہ سکتا
کیا کروں لہجۂ دربار کہاں سے لاؤں

آپ کے شہر میں رونق تو بہت ہے لیکن
اپنے گھر کے در و دیوار کہاں سے لاؤں؟

صوت و الفاظ کی ضرب پہ بھروسہ ہے مجھے
میں تہی دست ہوں تلوار کہاں سے لاؤں

میں تو بک سکتا ہوں صرف ایک تبسّم کے عوض
لیکن اب ایسے خریدار کہاں سے لاؤں

غم زدہ لوگ تو مل سکتے ہیں جتنے چاہو
آج کے دور میں غم خوار کہاں سے لاؤں

مجھ کو معلوم ہے میں جنسِ گراں ہوں اقبالؔ
لیکن اب مصر کا بازار کہاں سے لاؤں

ضبط بھی چاہئے، ظرف بھی چاہئے اور محتاط پاسِ وفا چاہیئے
زندگی دشمنوں میں بھی مشکل نہیں، آدمی میں ذرا حوصلہ چاہیئے

ہم کو منزل شناسی پہ بھی ناز ہے اور ہم آشنائے حوادث بھی ہیں
جوئے خوں سے گزرنا پڑے بھی تو کیا، جستجو کو تو اک راستہ چاہیئے

اپنے ماتھے پہ بل ڈال کر تم ہمیں شیش محلوں کے اندر سے جھڑکی نہ دو
ہم بھکاری نہیں ہیں کہ ٹل جائیں گے، ہم کو اپنی وفا کا صلہ چاہئے

تم نے آرائشِ گلستاں کے لئے، ہم سے کچھ خون مانگا تھا مدت ہوئی
تم سے خیرات تو ہم نہیں مانگتے، ہم کو اس خون کا خوں بہا چاہئے

میری مانو تو اک بات تم سے کہوں، یہ نیا دور ہے اس کا کیا ٹھیک ہے
دوستوں سے ملو محفلوں میں مگر آستینوں کا بھی جائزہ چاہئے

حد سے بڑھ کر محبت مناسب نہیں، اس میں اندیشۂ بدگمانی بھی ہے
دشمنوں سے تعلق تو ہے ہی غلط، دوستوں میں بھی کچھ فاصلہ چاہیئے

ہم کو ہر موڑ پر دوست ملتے رہے، ہم کبھی راہِ منزل میں تنہا نہ تھے
کل غمِ دوست تھا، اب غمِ زیست ہے، آشنا کو تو اک آشنا چاہیئے

قفلِ زنداں اگر تم نہیں کھولتے، کم سے کم لب کشائی کی مہلت تو دو
ہم نوا گر ہیں کوئی گداگر نہیں، ہم اسیروں کو اذنِ نوا چاہیئے

جرمِ بے باک گوئی کی پاداش میں زہر اقبالؔ کو زندگی نے دیا
اُس نے اُس زہر کو بھی سخن کر لیا، اس زمانے کو اب اور کیا چاہیئے

○

خطا معاف، یہ کچھ اور ہے حیا تو نہیں
کہیں یہ ترکِ تعلّق کی ابتدا تو نہیں

یہ بات الگ ہے کہ آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے
مگر زباں سے کبھی ہم نے کچھ کہا تو نہیں

خطا تو جب ہو کہ ہم عرضِ مدّعا بھی کریں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

جو بات دل میں ہے بے خوف کیوں نہیں کہتے
زبان و قلب میں کچھ ایسا فاصلہ تو نہیں

نصیب کیسے بدل دے کوئی سفینے کا
جو ناخدا ہے وہ سب کچھ سہی خدا تو نہیں

میں ان کی بات کا کوئی اثر نہیں لیتا
مرے عدو کہیں اس بات پہ خفا تو نہیں

ابھی سے اس کے نتائج کا تجزیہ نہ کرو
یہ ابتدا ہے مسافت کی، انتہا تو نہیں

نہ جانے قافلے والے خفا ہیں کیوں مجھ سے
میں صرف ایک مسافر ہوں، رہنما تو نہیں

حضور! آپ نے اقبال کو غلط سمجھا
وہ پارسا ہے مگر آدمی بُرا تو نہیں

یہ مری انا کی شکست ہے نہ دوا کرو نہ دعا کرو
جو کرو تو بس یہ کرم کرو مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

وہ جو ایک ترکشِ وقت ہے ابھی اس میں تیر بہت سے ہیں
کوئی تیر تم کو نہ آ لگے مرے زخمِ دل پہ نہ یوں ہنسو

نہ میں کوہکن ہوں نہ قیس ہوں مجھے اپنی جان عزیز ہے
مجھے ترکِ عشق قبول ہے جو تمہیں یقینِ وفا نہ ہو

جو تمہارے دل میں شکوک ہیں تو یہ عہد نامے فضول ہیں
جو مرے خطوط ہیں پھاڑ دو یہ تمہارے خط ہیں سمیٹ لو

جو کسی کو کوئی ستائے گا تو گلہ بھی ہونٹوں تک آئے گا
یہ تو اک اصول کی بات ہے جو خفا ہے مجھ سے کوئی تو ہو

مجھے اب صداؤں سے کام ہے مجھے خال و خد کی خبر نہیں
تو پھر اس فریب سے فائدہ یہ نقاب اب تو اُتار دو

مجھے اپنے فقر پہ ناز ہے مجھے اس کرم کی طلب نہیں
میں گدا نہیں ہوں فقیر ہوں یہ کرم گداؤں میں بانٹ دو

یہ فقط تمھارے سوال کا مرا مختصر سا جواب ہے
یہ گلہ نہیں ہے خلوص ہے مری گفتگو کا اثر نہ لو

یہ ادھورے چاند کی چاندنی بھی اندھیری رات میں کم نہیں
کہیں یہ بھی ساتھ نہ چھوڑ دے ابھی روشنی ہے چلے چلو

○

درد بڑھ کر خود دوا ہو جائے تو ہم کیا کریں
چارہ گر ہم سے خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

عین ممکن تھا کہ ہم بھی غم سے پا جاتے نجات
دل مگر غم آشنا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم زباں سے کچھ کہیں تو آپ کا شکوہ بجا
کوئی آنسو لب کشا ہو جائے تو ہم کیا کریں

اپنی جانب سے تو کی ہم نے ہمیشہ احتیاط
پھر بھی بھولے سے خطا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکمِ سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں

معذرت کرنے کو ہم کر لیں، مگر کس جرم کی
بے سبب کوئی خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

بے وفا کہہ کر تمہیں ہم خود بھی پچھتائے مگر
بے رُخی حد سے سوا ہو جائے تو ہم کیا کریں

شکوہ سنجی کی ہمیں اقبالؔ عادت تو نہیں
زندگی صبر آزما ہو جائے تو ہم کیا کریں

○

کچھ ایسے زخم بھی درپردہ ہم نے کھائے ہیں
جو ہم نے اپنے رفیقوں سے بھی چھپائے ہیں

یہ کیا بتائیں کہ ہم کیا گنوا کے آئے ہیں
بس اِک ضمیر بمشکل بچا کے لائے ہیں

یہ کربِ تشنہ لبی اب ہمیں قبول نہیں
کچھ آج سوچ کے ہم، میکدے میں آئے ہیں

کوئی ہواؤں سے کہہ دے اِدھر کا رُخ نہ کریں
چراغ ہم نے سمجھ بوجھ کر جلائے ہیں

چمن میں اب کے ہوا دیکھیے کدھر کی چلے
خزاں نصیبوں نے پھر آشیاں بنائے ہیں

بدل ہی جاتا ہے غربت میں آدمی کا مزاج
کبھی کبھی ہمیں دشمن بھی یاد آئے ہیں

جہاں بھی ہم نے صدا دی، یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں، پوچھو کہاں سے آئے ہیں

سفر پہ نکلے ہیں ہم پورے اہتمام کے ساتھ
ہم اپنے گھر سے کفن ساتھ لے کے آئے ہیں

اُنھیں پرائے چراغوں سے کیا غرض اقبالؔ
جو اپنے گھر کے دیے خود بُجھا کے آئے ہیں

○

حادثات سحر و شام کو الزام نہ دو
حسبِ عادت غمِ ایام کو الزام نہ دو

تم نے خود نور کا ظلمت سے کیا ہے سودا
کرکے توہینِ سحر، شام کو الزام نہ دو

تم نے خود اپنے پَر و بال کی تعظیم نہ کی
اب فریبِ قفس و دام کو الزام نہ دو

تم نے پیغام کا مفہوم غلط سمجھا تھا
مقصدِ صاحبِ پیغام کو الزام نہ دو

عینِ مقصود سمجھ بیٹھے تھے آغاز کو تم
اب اُس آغاز کے انجام کو الزام نہ دو

اپنے مشکوک عزائم کو عزائم کہہ کر
پے بہ پے کوششِ ناکام کو الزام نہ دو

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردشِ ایام کو الزام نہ دو

(۱۹۸)

○

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہُوا
مری آنکھ کیسے چھلک گئی، مجھے رنج ہے یہ بُرا ہُوا

مری زندگی کے چراغ کا، یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی، ابھی تیرگی، نہ جلا ہُوا نہ بُجھا ہُوا

مجھے جو بھی دُشمنِ جاں ملا، وہی پُختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہُوا

مُجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے یہ خود اپنے دل ہی سے پوچھئے
مری داستانِ حیات کا تو ورق ورق ہے کُھلا ہُوا

جو نظر بچا کے گُزر گئے مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے مرے گھر سے گھر ہے مِلا ہُوا

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

مرے ایک گوشۂ فکر میں، مری زندگی سے عزیز تر
مرا ایک ایسا بھی دوست ہے جو کبھی ملا نہ جدا ہوا

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا، کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

مجھے ہم سفر بھی ملا کوئی تو شکستہ حال مری طرح
کئی منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستے میں لٹا ہوا

ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے سرِ راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا، نہ سفر کا حق ہی ادا ہوا

تری نگاہ کی ہر جنبش حجابانہ
تمام ساغر و مینا تمام میخانہ

ترا تبسمِ معصوم شعر و افسانہ
تری نگاہ غزل اور غزل بھی رندانہ

نظر نظر میں کسی سے کسی کا افسانہ
بیاں ہوا ہے سرِ بزم رازدارانہ

قدم قدم پہ مرتب ہوا ہے افسانہ
جدھر جدھر سے گزرتا گیا ہے دیوانہ

نظامِ قلب و نظر اب ہے آئینہ خانہ
کوئی قریب سے گزرا ہے بے حجابانہ

مرے تصورِ رنگیں میں کوئی یوں آیا
چمن میں جیسے چلی آئے شامِ میخانہ

چھٹا ہے ہاتھ سے دامن کسی کا یوں اقبالؔ
لبوں تک آکے چھلک جائے جیسے پیمانہ